تیسرا رنگ
کُشتہ جفا
ایچ اقبال
سیف الملوک عباسی عقیل قریشی محمد
نعمان محمد سجاد بھٹی
جاسوسی ڈائجسٹ : نومبر 1999

کشتۂ جفا

ایچ اقبال

جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ جوانی کی دیوانگی اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب دولت بھی ہاتھ میں ہو۔ ایسی صورت میں انسان کو بھٹکتے دیر نہیں لگتی اور وہ کسی ایسی گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے اثرات تمام زندگی پر بھی محیط ہوسکتے ہیں۔ ایک ایسے ہی گمراہ انسان کا فسانۂ عبرت جس کا ماضی ایک بھیانک روپ دھار کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

ایک صاحبِ کردار دوشیزہ کے بے کردار ہونے کا چشم کشا احوال

شادی کی تقریب اختتام کو پہنچتے پہنچتے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔

"سبزہ زار" کے لان سے نکلتے ہوئے معروف صنعت کار جمشید خاں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "اگر یہ ایک بڑے سرکاری افسر کی تقریب نہ ہوتی تو میں ہرگز نہ آتا۔ میری طبیعت ویسے ہی خاصی ڈل تھی۔ تم الگ بور ہوئیں۔"

"نہیں ڈیڈی!" سمیرا بولی "میں بور نہیں ہوئی۔"

"بور تو یقیناً ہوئی ہوگی۔ تمہارا کوئی شناسا تو تھا نہیں یہاں۔"

"مجبوری بھی تو تھی ڈیڈی۔ آپ کی طبیعت اتنی ڈل تھی کہ آپ ڈرائیونگ نہیں کرپاتے۔"

"اتنی دیر میں اور نڈھال ہوگیا ہوں۔"

"ڈرائیونگ تو میں ہی کروں گی نا ڈیڈی۔ آپ سیٹ کو تھوڑا سا پیچھے کی طرف لٹا کر نیم دراز حالت میں آنکھیں بند کرلیجئے گا۔ ہم آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جائیں گے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں جمشید خاں کی کار کھڑی تھی۔ سمیرا نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ جمشید خاں دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ سمیرا انجن اسٹارٹ کرنے لگی۔

"گیارہ چالیس ہونے والے ہیں۔" جمشید خاں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی سنہرے ڈائل کی گھڑی پر نظر ڈال کر بے زار سے لہجے میں کہا "ہمیں اب اپنا راستہ بھی سنسان ملے گا۔ آج کل شہر کے حالات ویسے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔"

"ایسے حالات میں تیز ڈرائیونگ کرنا چاہیے۔" سمیرا نے کہا "اور اگر راستے میں کوئی لفٹ لینا چاہے تو اسے نظر انداز کردینا ان حالات میں کوئی غیر انسانی حرکت بھی نہیں ہوگی۔" سمیرا، کار حرکت میں لے آئی۔

"ابھی گھر جاکر سو بھی نہیں سکتا۔" جمشید خاں نے کہا "ایک بجے کے قریب لندن سے سائرہ کا فون آئے گا۔"

"اس کی فلائٹ یہاں کے وقت کے مطابق غالباً بارہ بجے لندن پہنچے گی۔"

"ہاں۔" جمشید خاں نے کہا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ایک بجے تک اس کے فون کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ڈیڑھ دو بج جائیں۔"

"آج جب آپ اسے ائرپورٹ چھوڑنے گئے تھے، تب بھی ڈرائیونگ میں خاصے تھکے ہوں گے۔ آج میرا یونیورسٹی جانا بے حد ضروری تھا ورنہ میں ہی اسے چھوڑ آتی۔"

"جاتے وقت تو سائرہ ہی نے ڈرائیونگ کی تھی، لیکن واپسی پر ہی ڈرائیونگ کرکے میں خاصا تھک گیا تھا۔ آج میری طبیعت صبح ہی سے ٹھیک نہیں رہی ہے۔"

"وہ ایم، بی، اے کرکے آجائے گی تو آپ کو خاصا سہارا ہوجائے گا۔"

"میں تو تمہیں ہی ایم، بی، اے کرانا چاہتا تھا۔ تم کبھی کی کرکے آ بھی چکی ہوتیں۔"

"میرا مزاج ذرا مختلف ہے نا ڈیڈی۔ سائرہ میں ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ آپ کے لیے بے حد کارآمد ہوگی۔"

کار اب بے حد سنسان راستے پر تھی اس لیے سمیرا نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

"آپ سیٹ ٹھیک کرکے نیم دراز ہوجائیں نا ڈیڈی۔" سمیرا پھر بولی۔

"نہیں۔ ٹھیک ہے۔ اس طرح اردگرد کا ماحول میری نظر میں رہے گا۔ شہر کے حالات آج کل میرے اعصاب پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہونے لگے ہیں۔"

"شاید اسی لیے آج آپ کی طبیعت بھی خراب ہوئی ہے یا پھر آپ کے ذہن پر سائرہ کے جانے کا دباؤ ہوگا۔ وہ مہینے دو مہینے کے

لیے تو گئی نہیں ہے۔"

"بس اب کار روک دو۔" اچانک پشت سے ایک مردانہ آواز سنائی دی اور جمشید خاں بوکھلا گیا۔ ایک ریوالور کی نال اس کے سر سے آ لگی تھی۔ اس نے دیکھا کہ دوسری نال سمیرا کے سر سے لگی ہوئی تھی اور اسٹیئرنگ پر سمیرا کے ہاتھ بہک گئے تھے۔ کار سڑک پر لہرا گئی تھی۔

"کار سنبھالو لڑکی!" عقب سے بہت سخت لہجے میں کہا گیا "میں جانتا ہوں کہ تم بہت اچھی ڈرائیونگ کرتی ہو۔"

کار سیدھی چلنے لگی۔

"اب آہستہ آہستہ رفتار کم کرو۔" پشت سے آواز آئی "سامنے سے کوئی کار آ رہی ہے۔ جب وہ گزر جائے گی تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم اپنی کار کس جگہ روکو۔" اس نے دونوں ریوالور، جمشید خاں اور سمیرا کے سروں سے ہٹا لیے اور کہا "ریوالوروں کا رخ اب بھی تم دونوں کی کھوپڑیوں کی طرف ہے۔ کوئی بھی غلط حرکت کی گئی تو میں تم دونوں کی کھوپڑیاں اڑا دوں گا۔ چلتی کار سے کود جانے کی مجھے خاصی مہارت ہے۔"

جمشید خاں سمجھ گیا کہ ریوالوران کے سروں سے ہٹانے کی وجہ سامنے سے آنے والی کار ہوگی۔ وہ شخص نہیں چاہتا ہوگا کہ اس کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظر ریوالوروں پر پڑ جائے۔

"اب آہستہ آہستہ بریک لگاؤ اور کار روک دو۔" حکم ملا۔

جمشید خاں نے محسوس کیا کہ سمیرا بہت تیز تیز سانسیں لے رہی تھی جس سے اس کی گھبراہٹ اور خوفزدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تم کون ہو؟" جمشید خاں بھرائی ہوئی آواز میں بولا "کیا چاہتے ہو؟"

"بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

کار رک گئی۔ اسی وقت پشت سے ایک ہاتھ آگے آیا اور جمشید خاں کے منہ اور ناک پر جم گیا۔ اس ہاتھ میں کوئی رومال یا کسی قسم کا کپڑا تھا جس سے خاصی تیز قسم کی بو آ رہی تھی۔ اس بو نے جمشید خاں کے حواس معطل کر دیے۔

○☆○

وائرلیس پر ملنے والا پیغام سنتے ہی پولیس اسٹیشن کے ایس' ایچ' او نے ایک سب انسپکٹر کو ساتھ لیا اور اپنے اردلی سے کچھ کہہ کر جیپ میں تیزی سے روانہ ہو گیا۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا۔

"معاملہ کیا ہے صاحب!" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"موبائل نمبر ایک سو بارہ سے پیغام ملا ہے کہ انہیں ایک ویران جگہ پر ایک کار کھڑی ہوئی ملی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک جوان لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ کار کے اندر کلوروفارم کی ہلکی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

"موبائل سے وائرلیس پر مجھے پیغام بھیج کر وہ اس لڑکی کو اسپتال لے گئے ہیں۔ وہ کار ابھی وہیں کھڑی ہے۔ دو کانسٹیبلوں کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا ہے۔"

"یہ سب کچھ تو اب ہمارے شہر میں ہوتا ہی رہتا ہے صاحب۔ آپ تو مجھے بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔"

"معاملہ ایک بہت مال دار آدمی کا ہے۔ کار کے ڈیش بورڈ کے خانے سے وزیٹنگ کارڈز رکھنے کی پلاسٹک کی ڈبیا ملی تھی۔ اس میں جو کارڈز رکھے تھے وہ ایم' جے ٹیکسٹائل ملز کے مالک جمشید خاں کے ہیں۔ لڑکی کی گود میں جو پرس تھا' اس میں میک اپ کے ہلکے پھلکے سامان اور چند ہزار روپوں کی کرنسی کے علاوہ جو وزیٹنگ کارڈز ملے ہیں' ان پر سمیرا جمشید لکھا ہوا ہے۔"

"یہ تو کچھ عجیب سا معاملہ ہے۔ کوئی اسے اغوا کرنے کے بجائے بے ہوش کر کے کیوں چھوڑ گیا۔"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ڈیش بورڈ کے خانے سے جمشید خاں کے وزیٹنگ کارڈز کی ڈبیا کیوں ملی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کار اس کے استعمال میں رہتی تھی۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہے کہ اس کی بیٹی کی کار تو الگ ہوگی۔"

"ممکن ہے اس کی کار میں کوئی خرابی ہو گئی ہو اور وہ اپنے باپ کی کار لے کر نکل کھڑی ہوئی ہو۔"

"اتنی رات کو کہاں جا رہی ہوگی؟"

"تو پھر کہیں سے واپس لوٹ رہی ہوگی۔"

"اب میں تمہاری ہی بات دہراؤں گا کہ کوئی اس لڑکی کو اغوا کرنے کے بجائے بے ہوش کر کے کیوں چھوڑ گیا۔ یہ تو ایک بے مقصد سی حرکت ہے اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ کار میں باپ بیٹی دونوں ہی ہوں گے۔ باپ کو اغوا کر لیا گیا اور بیٹی کو چھوڑ دیا گیا۔"

سب انسپکٹر نے سر ہلایا "ہاں یہ ممکن تو ہے اور اس کی تصدیق جمشید خاں کے گھر فون کر کے کی جا سکتی تھی۔ اس کے اور اس کی بیٹی کے وزیٹنگ کارڈز پر ان کے گھر کے فون نمبر تو ہوں گے۔"

"پیغام دینے والے نے صرف وزیٹنگ کارڈز کے بارے میں بتایا تھا اور مجھے بھی خیال نہیں آیا کہ ٹیلی فون نمبر معلوم کر لوں ورنہ تھانے ہی سے پہلے اس کے گھر فون کر لیا جاتا۔"

"تو اب معلوم کر لیجیے۔"

جیپ میں وائرلیس موجود تھا۔

"ٹیلی فون تو اب اسپتال سے ہی کیا جا سکے گا۔"

"ہوں۔" سب انسپکٹر نے ایک طویل سانس لی اور کچھ سوچتا ہوا بولا "کیا یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہو سکتا ہے؟"

"باپ بیٹی دونوں ساتھ تھے اس لیے بیٹی کو اغوا کرنا تاوان کے لیے زیادہ بہتر ہوتا۔" ایس' ایچ' او نے کہا "لیکن ہم ابھی سے کسی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ اس لڑکی کے بیان ہی سے صحیح صورت حال سامنے آ سکے گی۔"

"اسپتال پہنچ کر ہی معلوم ہو سکے گا کہ وہ ہوش میں آئی یا نہیں۔"

"اور اسپتال ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔" ایس' ایچ' او نے جیپ کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

وہ اسپتال پولیس اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔

○☆○

جمشید خاں کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک کرسی پر جکڑا ہوا پایا۔ اسے باندھنے کے لیے مضبوط ریشمی ڈوری کام میں لائی گئی تھی۔

وہ کرسی جس کمرے میں تھی، وہاں پھیلے ہوئے سامان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بڑے گھر کا اسٹور روم تھا لیکن دو چیزیں ایسی بھی تھیں، جن کی اسٹور روم میں موجودگی عجیب سی تھی۔ ایک وی سی آر اور ایک ٹیلی ویژن جو جمشید خاں کی آنکھوں کے سامنے دیوار کے قریب ایک چھوٹی سی ٹرالی پر رکھا ہوا تھا۔

کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی۔ دروازہ بھی بند تھا اس لیے بیرونی روشنی کمرے میں نہیں آسکتی تھی لیکن دو ٹیوب لائٹس نے کمرے کو خاصا روشن کر رکھا تھا۔

جمشید خاں کے ہاتھ کرسی کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ اپنی کلائی پر موجود گھڑی میں وقت نہیں دیکھ سکتا تھا اور خود اسے یہ اندازہ ہو نہیں رہا تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ صرف بھوک اور پیاس کے احساس کی وجہ سے وہ سوچ سکتا تھا کہ اس کی بے ہوشی بہت دیر تک رہی تھی ورنہ اسے اتنی بھوک پیاس محسوس نہیں ہوتی۔ شادی کی تقریب سے وہ کھانا کھا کر چلا تھا۔ تو پھر شاید صبح ہو چکی ہو۔

سمیرا پر نہ جانے کیا بیتی ہو، اس نے سوچا، اگر اسے بھی اغوا کیا جاتا تو وہ اس کے ساتھ ہوتی، یا شاید اسے کسی وجہ سے الگ رکھا گیا ہو۔

مگر کیوں؟

جمشید خاں کے دماغ پر خوف اور پریشانی کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ چونکا۔

دروازے سے کمرے میں آنے والا ایک جوان العمر شخص تھا۔ اس نے نیلی جینز، سفید قمیص اور چمڑے کی براؤن جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں براؤن شوز تھے۔ چہرے سے وہ کوئی جرائم پیشہ نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید اور نقش و نگار دلکش تھے۔ آنکھیں نمایاں حد تک نیلی تھیں۔

وہ جمشید خاں کے سامنے صرف چار فٹ کے فاصلے پر ٹانگیں کسی حد تک پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر جمشید خاں کو گھورنے لگا۔

"کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟" جمشید خاں کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"واہ!" نیلی آنکھوں والا حقارت سے مسکرایا "ہو تو تم خاں لیکن بولے ہو کسی حد درجہ بزدل شخص کی طرح!"

جمشید خاں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اسے گھورنے لگا۔

"ہاں۔ اب مزہ آئے گا آنکھیں ملا کر بات کرنے میں۔ میری طرح تمہاری آنکھیں بھی نیلی ہیں لیکن میری آنکھیں تمہاری آنکھوں سے زیادہ گہری ہیں۔ کیا اس سے یہ شگون لیا جا سکتا ہے کہ میں تم پر بھاری پڑوں گا؟"

"ادھر ادھر کی فضول باتیں کیوں کر رہے ہو؟" جمشید خاں نے اپنے لہجے میں مضبوطی پیدا کرنے کی کوشش کی "تم نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟ اور میری بیٹی کہاں ہے؟"

"گڈ!" نیلی آنکھوں والے نے سرہلایا "اب تم نے کچھ دلیری سے بولنے کی کوشش کی ہے۔ تمہاری بیٹی کو اغوا نہیں کیا گیا ہے جمشید خاں! اسے بس بے ہوش کر کے تمہاری کار میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد تمہاری کار ایک پولیس موبائل کو مل گئی تھی۔ تمہاری بیٹی کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ وہاں وہ ہوش میں آ کر بیان بھی دے چکی ہے... اپنے گھر بھی چلی گئی ہے۔ ارے! تم کچھ سوچنے لگے۔ ہاں! تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ اگر یہ سب کچھ ہو چکا ہے تو تم کتنی دیر بے ہوش رہے ہو۔ چلو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ اس میں میرا کوئی حرج نہیں ہے۔ رات گزر چکی ہے جمشید خاں۔ اب تو صبح ہو چکی ہے، بلکہ پونے دس بج رہے ہیں۔"

جمشید خاں کی سمجھ میں تو پہلے ہی آ گیا تھا کہ اس کی بھوک پیاس کا سبب اس کی بے ہوشی کی طوالت ہی ہو سکتی ہے۔ اب اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔

"لیکن۔" نیلی آنکھوں والے نے کہا "تم صرف کلوروفارم سے اتنی دیر بے ہوش نہیں رہ سکتے تھے۔ تمہیں یہاں لانے کے بعد تمہیں ایک خواب آور دوا کا انجکشن دے دیا گیا تھا۔ دراصل کسی وجہ سے میں رات کو یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ دیکھو جمشید

خاں! میں تم سے کتنے دوستانہ انداز میں گفتگو کر رہا ہوں۔ مقصد اس کا صرف یہ ہے کہ جب میں اصل معاملے کی طرف آؤں تو تمہارا اندازِ گفتگو بھی دوستانہ ہی ہو۔ اگر تم نے سرکشی کا ثبوت دیا تو مجھے مایوسی ہوگی۔ تم بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان کیوں پھیر رہے ہو؟ کیا پیاس لگ رہی ہے؟"

جمشید خاں نے سر ہلا دیا۔

"تو زبان سے کہتے نا۔" نیلی آنکھوں والے نے کہا "میں اب تک تمہیں پانی پلا چکا ہوتا۔ پیاس ہی نہیں، تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہوگی لیکن پہلے تم اپنی پیاس تو بجھا لو تاکہ گفتگو میں آسانی رہے۔"

وہ آگے بڑھ کر جمشید خاں کے پیچھے چلا گیا۔ جمشید خاں نے سر گھما کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ نیلی آنکھوں والا دوبارہ اس کے سامنے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فلاسک جگ اور ایک گلاس تھا۔

جمشید خاں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لیے نیلی آنکھوں والے نے اسے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ پھر اس نے فلاسک جگ اور گلاس وہیں فرش پر رکھ دیے اور پہلے ہی کی طرح سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ جمشید خاں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"یہ لگ بھگ ستائیس سال پہلے کی بات ہے۔" نیلی آنکھوں والے نے کہا "اس وقت تمہاری عمر اتنی ہی ہوگی جتنی اس وقت میری ہے۔ تم اس وقت خاصے پُرکشش بھی تھے۔ اس وقت تم نے ایک لڑکی سے خفیہ طور پر نکاح کیا تھا۔"

جمشید خاں چونکا لیکن پھر فوراً ہی اس نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا "کیا تم مجھے کوئی کہانی سنانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" نیلی آنکھوں والے نے سرد لہجے میں کہا "اس لڑکی کی دردناک کہانی جس سے تم نے نکاح کیا تھا۔ اس کا نام بابرہ طلعت تھا۔ میرا خیال ہے کہ ستائیس سال میں تمہاری یادداشت اتنی خراب نہیں ہوئی ہوگی کہ تم اس لڑکی کا نام بھی بھول گئے ہو۔"

"میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔" جمشید خاں نے تیزی سے کہا لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا تھا کہ یہ نوجوان کون ہے اور بابرہ طلعت کے بارے میں کیسے جانتا ہے؟

"تم جھوٹ بول رہے ہو جمشید خاں!" نوجوان نے کہا "اور اس جھوٹ کی وجہ سے وہ گفتگو آگے نہیں چل سکتی جو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"کسی بے بنیاد بات پر گفتگو ہو بھی کیسے سکتی ہے۔" جمشید خاں نے کہا اور اس موقع پر اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا تھا کہ کیا یہ نوجوان کوئی بلیک میلر ہو سکتا ہے؟

"میں کوئی بے بنیاد بات نہیں کر رہا ہوں جمشید خاں۔" نیلی آنکھوں والے نوجوان نے غیر جذباتی انداز میں کہا "مجھے اس معاملے کی ساری تفصیل معلوم ہے۔ یہ مت سمجھو کہ مجھے کہیں سے صرف اس نکاح کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ بابرہ طلعت کا تعلق اس شہر سے نہیں تھا جہاں ہم اس وقت ہیں لیکن تمہارا تعلق اس وقت بھی یہیں سے تھا۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ تم بابرہ طلعت کے شہر کیوں پہنچے تھے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہاں بابرہ طلعت کو دیکھ کر تم اس کے حسن کے اسیر ہو گئے تھے۔ وہ ایک اوسط درجے کے گھرانے کی لڑکی تھی۔ تم نے کسی طرح اس سے ربط ضبط بڑھا لیا اور وہ بھی تمہیں پسند کرنے لگی۔ اس پسندیدگی کے معاملے میں تم دونوں کی خواہشات الگ الگ تھیں۔ بابرہ طلعت چاہتی تھی کہ وہ شادی کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جائے لیکن تم اس سے صرف ناجائز تعلقات رکھنا چاہتے تھے۔ شاید اس وقت تمہارا مزاج ہی یہ ہو اور تم بہت سی لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکے ہو لیکن مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ مجھے صرف تمہارے اور بابرہ کے بارے میں علم ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد جب تمہیں احساس ہو گیا، بلکہ یقین ہو گیا کہ تم بابرہ طلعت کو اپنی خواہش کے مطابق حاصل نہیں کر سکتے تو تم نے اسے اغوا کروا لیا۔ تمہارے لیے یہ کام تمہارے ایک دوست داور نے کیا تھا جو کوئی باقاعدہ جرائم پیشہ تو نہیں تھا لیکن جرائم پسند ضرور تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جرائم کی طرف تھوڑا بہت مائل ضرور تھا ورنہ تم اس کے ذریعے بابرہ طلعت کو اغوا کروانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔"

جمشید خاں کو گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ نیلی آنکھوں والے نوجوان کی کوئی بات غلط نہیں تھی۔

"داور۔" نوجوان کہتا رہا "اوسط درجے کے طبقے سے تعلق رکھنے والے بعض ایسے نوجوانوں میں سے تھا جو امیرزادوں سے دوستی کر کے انہی کے سہارے زندگی گزارتے ہیں یا ان کے ذریعے کچھ بن جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم بھی ایک امیرزادے تھے۔ اسی لیے داور نے تم سے دوستی گانٹھی تھی۔ تم اس کے ذریعے بابرہ طلعت کو اغوا کرانے میں تو کامیاب ہو گئے تھے لیکن تمہیں اپنا مقصد حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ بابرہ طلعت کو اغوا کر کے ایک ایسے مکان میں لے جایا گیا تھا جو داور نے تمہارے پیسے سے کرائے پر لیا تھا۔ بابرہ طلعت کو اغوا کروانے کے بعد تمہارا ارادہ شاید یہ ہو کہ تم وقتاً فوقتاً اس مکان میں جا کر بابرہ طلعت کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہو گے لیکن تمہاری یہ خواہش ایک بار بھی پوری نہیں ہو سکی۔ تم نے داور ہی کے ذریعے اس مکان کے ایک کمرے کو خاصا آراستہ اس لیے کروایا تھا کہ وہیں بابرہ طلعت کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہو گے لیکن بابرہ طلعت بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مر جائے گی لیکن تمہاری ہوس کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکائے گی۔ اسے جس آراستہ کمرے میں لے جا کر بند کیا گیا تھا وہاں ایک ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی۔ بابرہ طلعت نے اس ڈریسنگ

نیلم کا آئینہ توڑ کر اس کے دو نکیلے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ جب تم اس کمرے میں پہنچے تو بابرہ طلعت نے تم سے کہا کہ اگر تم نے اس کے نزدیک آنے کی کوشش کی تو وہ شیشے کے نکیلے ٹکڑے اپنے سینے میں گھونپ کر جان دے دے گی۔ تم نے اسے پچکارنے کی کوشش کی لیکن وہ تمہارے جھانسے میں نہیں آئی۔ تمہیں یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ وہ صرف دھمکی نہیں دے رہی تھی۔ اگر تم اس کے قریب جاتے تو وہ واقعی شیشے کے ٹکڑے اپنے سینے میں گھونپ لیتی۔ ممکن ہے وہ اس طرح فوراً نہیں مرتی لیکن اتنی بری طرح زخمی ضرور ہو جاتی کہ معاملہ سنبھالنا تمہارے لیے ناممکن ہو جاتا۔ اسے بہرحال اغوا کیا گیا تھا۔ اس کے ماں باپ پولیس میں رپورٹ بھی درج کرا چکے تھے۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی لیکن داور نے وہ کام اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ پولیس کسی بھی قسم کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی، لیکن اگر وہ اپنے سینے میں شیشہ گھونپ لیتی تو تم اسے نہ تو کسی اسپتال لے جا سکتے تھے، نہ وہاں کسی ڈاکٹر کو بلا سکتے تھے۔ جھنجلا کر تم نے اس سے کہا کہ اگر وہ تمہاری بات نہیں مانے گی تو اسے ساری زندگی اسی کمرے میں سڑنا پڑے گا، لیکن بابرہ طلعت سڑنے مرنے کے لیے تو تیار تھی لیکن اسے بے آبرو ہونا گوارا نہیں تھا۔ تم وہاں سے چلے آئے اور ایک ماہ تک دوبارہ نہیں گئے۔ داور اسی مکان میں رہتا تھا اور بابرہ طلعت کی خبر گیری کرتا تھا۔ اخراجات تم ہی پورے کرتے ہو گے۔ داور تم سے اخراجات سے زیادہ ہی رقم وصول کرتا ہو گا لیکن تمہیں اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ تم ایک بہت امیر باپ کے بیٹے تھے اور بابرہ طلعت کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تم ایک ماہ بعد پھر اس کے پاس گئے اور ایک ماہ کے وقفے سے اس کے پاس جاتے رہے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ تمہارا خیال تھا کہ قیدِ تنہائی میں زیادہ وقت گزرے گا تو آخر کار بابرہ طلعت کے اعصاب ٹوٹ جائیں گے۔ تم وہاں مستقل طور پر اس لیے نہیں رہتے ہو گے کہ تمہارا گھر تو یہاں تھا۔ تم اپنے باپ کے سامنے جواب دہ ہوتے ہو گے۔ تمہارے لیے بس اتنا ہی ممکن ہو گا کہ مہینے میں ایک آدھ بار کسی بہانے سے اپنا شہر چھوڑ کر بابرہ طلعت سے ملنے پہنچو... اور دیکھو کہ وہ تمہاری خواہش کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار ہوئی یا نہیں۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اتنے عرصے میں بھی بابرہ طلعت کے اعصاب نہیں ٹوٹے لیکن تم اس صورتِ حال سے تنگ آ گئے۔"

جمشید خاں کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا کہ نیلی آنکھوں والے نوجوان کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہو گئیں؟ بابرہ طلعت تو مر چکی تھی اور مردے کسی کو اپنی بپتا نہیں سنا سکتے۔ لے دے کر صرف داور ہی تھا جو کسی کو یہ سب کچھ بتا سکتا تھا لیکن اس کے پاس بھی کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس سے وہ داستان ثابت بھی کی جا سکتی۔

"جمشید خاں!" نوجوان پھر بولا "کیا میں نے اب تک کچھ غلط کہا ہے؟"

"تم مجھے ایک دلچسپ کہانی سنا رہے ہو۔" جمشید خاں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا!" نوجوان نے ایک طویل سانس لی "خیر! میں تمہیں مکمل کہانی سنا دینا چاہتا ہوں۔ اگر اس کے بعد بھی تم نے ان حقائق کو تسلیم نہیں کیا تو پھر مجبوراً مجھے دوسرا قدم اٹھانا پڑے گا۔"

جمشید خاں اسے گھورتا رہا۔

"بابرہ طلعت بہت اچھی لڑکی تھی جمشید خاں!" نوجوان نے دوبارہ بولنا شروع کیا "تمہارے کردار سے واقف ہو جانے کے باوجود وہ تمہیں چاہتی تھی۔ تنہائی میں وہ بہت رویا کرتی تھی۔ اس کے رونے کا سبب دو غم تھے۔ ایک تو اسے اپنی بہنیں اور ماں باپ یاد آیا کرتے تھے اور دوسرے وہ اس لیے رویا کرتی تھی کہ تم اسے شرعی طور پر اپنانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب بھی تم اس کے پاس جاتے تھے، وہ تم سے یہی کہتی تھی کہ وہ اب بھی تم سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہے پھر جب ایک سال گزر گیا تو تمہارے ہی اعصاب ٹوٹنے لگے۔ تم اس سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن تم نے اس سے یہ کہا کہ یہ نکاح تم کچھ عرصے تک خفیہ رکھو گے اور اس عرصے میں اپنے گھر والوں کو تیار کرو گے کہ وہ تمہیں اپنے گھر کی بہو تسلیم کر لیں۔ تمہاری اس بات پر بابرہ طلعت کچھ کھٹک گئی۔ اسے خیال آیا کہ تم اس سے جعلی نکاح نہ کر بیٹھو۔ اس نے تم سے کہا کہ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اس لیے اگر وہ کسی بات پر بھی کھٹک گئی کہ اس کے ساتھ نکاح کا صرف ڈراما کیا جا رہا ہے تو پھر وہ وہی قدم اٹھا بیٹھے گی جس کا عزم وہ سال بھر سے کیے بیٹھی ہے۔ حقیقت بھی یہ تھی کہ تم اس سے صرف ڈراما کرنا چاہتے تھے لہٰذا تم اس کی بات سے ڈر گئے۔ انتظار کرتے کرتے تمہارے ہی اعصاب ٹوٹ چکے تھے لہٰذا تم نے سچ مچ نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن...." نوجوان نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں "مجھے صبح تمہارے پاس جلدی آنا چاہیے تھا جمشید خاں! کسی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی اور اب مجھے ایک گھنٹے بعد کسی جگہ پہنچنا ہے۔ تم سے باقی باتیں میں واپس آ کے کروں گا لیکن جانے سے پہلے تمہیں کچھ کھلا دوں تو بہتر ہو گا۔ فی الحال میں تمہیں بھوکا نہیں مارنا چاہتا۔ میں تمہارے لیے اس وقت صرف برگر ہی لا سکا ہوں۔ یہ بھی میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔ تمہارے ہاتھ ابھی نہیں کھولے جا سکتے۔"

○☆○

انٹیلی جینس آفیسر صمد یار خاں نے اپنی چھوٹی سی لیکن صاف ستھری کار جمشید خاں کے بنگلے کے پھاٹک پر روکی اور ہارن دیا۔

چوکیدار نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر سر باہر نکالا اور جلد ہی پھر اندر کر لیا۔ صمد یار خاں نے محسوس کیا کہ چوکی دار نے اس پر

تو بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی لیکن اس کی کار کا نمبر بڑے غور سے دیکھا تھا۔

پھاٹک کھول دیا گیا تو صمد یار خاں نے کار آگے بڑھائی۔

"برآمدے کے سامنے جا کر روکیے گا اپنی گاڑی۔" چوکیدار نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

صمد یار خاں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس نے اپنی کار برآمدے ہی کے سامنے لے جا کر روکی۔

شلوار قمیص میں ملبوس ایک جوان اور خوب صورت لڑکی برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

غالباً یہی جمشید خاں کی بیٹی سمیرا ہے، صمد یار خاں نے سوچتے ہوئے کار کا انجن بند کیا۔

وہ برآمدے سے اتر کر کار کے پاس آگئی۔

صمد یار خاں نے کار سے اتر کر دروازہ بند کیا اور بولا "غالباً آپ مس جمشید ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ بولی "آپ...."

"میرا نام صمد یار خاں ہے۔"

"آپ کے محکمے کے ڈائریکٹر صاحب نے آدھے گھنٹے پہلے مجھے فون پر آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ آپ کی کار کا نمبر بھی بتا دیا تھا جو میں چوکیدار کو بتا چکی تھی۔ اب میں نے بھی آپ کی کار کا نمبر دیکھ لیا ہے لیکن میں اتنی پریشان ہوں کہ معذرت کے ساتھ آپ کا شناختی کارڈ دیکھنا چاہوں گی۔"

"ہاں ہاں۔ یہ اچھی بات ہے کہ انسان محتاط رہے۔" صمد یار خاں نے کہا اور اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اسے دکھایا۔

"شکریہ۔" سمیرا نے کہا "میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا کارڈ دیکھنا چاہا۔"

"آپ بلاوجہ معذرت کر رہی ہیں۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ محتاط رہنا اچھی بات ہے۔"

سمیرا نے اسے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا اور بولی "میں حیران ہوں کہ راتوں رات یہ کیس آپ کے محکمے میں کیسے پہنچ گیا۔"

"اس تقریب کی وجہ سے جس میں کل آپ شریک ہوئی تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری ہیں جن کی بیٹی کی شادی میں آپ شریک ہوئی تھیں۔ رات کو آپ نے پولیس کو جو بیان دیا تھا اس کی تصدیق کے لیے پولیس نے سیکریٹری صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ انہیں جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ آپ کے ڈیڈی کیونکہ ان کے گھر کی تقریب میں شرکت کی وجہ سے ایک غیر معمولی صورتِ حال کا شکار ہوئے ہیں اس لیے سیکریٹری صاحب بے چین ہو گئے کہ اس معاملے کی تحقیق زیادہ بہتر سطح پر ہو اور آپ کے ڈیڈی کو جلد از جلد بازیاب کرایا جائے۔ انہی کی کوششوں سے یہ کیس راتوں رات میرے محکمے میں آگیا ہے اور صبح ہی صبح ڈائریکٹر صاحب نے یہ ذمے داری مجھے سونپ دی ہے۔"

"خدا جانے میرے ڈیڈی کس حال میں ہوں گے۔" سمیرا کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ہمت سے کام لیجیے مس جمشید۔ ویسے آپ مجھے خاصی باہمت ہی معلوم ہو رہی ہیں۔ آپ کو یہ اطمینان تو ہو گا ہی کہ آپ کے ڈیڈی زندہ تو بہرحال ہوں گے۔ اگر کوئی نامعلوم شخص انہیں مارنا ہی چاہتا ہو تو اغوا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"پھر آخر...." سمیرا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا "کیا یہ اغوا برائے تاوان کا مسئلہ ہے؟"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ وہ ایسا موقع تھا کہ جمشید صاحب کے بجائے آپ کا اغوا کیا جاتا اور پھر جمشید صاحب سے آپ کی رہائی کے عوض کوئی بڑی رقم مانگی جاتی۔"

"تو پھر آخر یہ کیا ہوا ہے؟"

"یہی چھان بین کرنے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی ہے۔" صمد یار خاں نے کہا "اسی لیے آپ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔"

"پولیس کو میں بیان دے چکی ہوں۔"

"اس کے باوجود میں آپ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھیے۔" سمیرا نے پہلو بدلا۔

"آپ کسی ایسے شخص کو جانتی ہیں جس سے کسی بات پر جمشید صاحب کی ناچاقی ہو گئی ہو؟"

"اگر کوئی ایسا شخص ہے تو میں اس سے بے خبر ہوں۔"

"میں آپ کے بیان میں پڑھ چکا ہوں کہ جب آپ کو بے ہوش کیا گیا تھا تو چار آدمی بڑی تیزی سے آپ کی کار کی طرف آئے تھے۔"

"جی ہاں۔" سمیرا نے کہا "جب میری ناک اور منہ پر کلوروفارم کا رومال یا کوئی کپڑا رکھا گیا تھا، اس سے صرف دو تین لمحے پہلے میری نظر ان چاروں آدمیوں پر پڑی تھی۔"

"کبھی آپ انہیں کہیں دیکھیں گی تو پہچان سکیں گی؟"

"نہیں۔" سمیرا نے کہا "میرے بیان میں آپ نے یہ بات نہیں پڑھی کہ ان چاروں نے اپنے چہروں پر کسی قسم کی نقابیں چڑھا رکھی تھیں؟"

"ان کی وضع قطع؟ میرا مطلب ہے وہ دبلے تھے یا صحت مند، لمبے تھے یا پستہ قد؟"

"دو تین لمحوں میں یہ سب کچھ کیسے ذہن نشین ہو سکتا ہے؟"

صمد یار خاں کچھ سوچنے لگا، پھر بولا "وہ نامعلوم شخص آپ کی کار کی پچھلی سیٹ پر کیسے پہنچ گیا؟"

"کار وہاں کئی گھنٹے کھڑی رہی تھی۔ کسی کو بھی اس کا موقع مل سکتا ہے۔"

"لیکن وہ اندر کیسے داخل ہوا؟ کیا آپ گاڑی لاک کر کے نہیں گئی تھیں؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے گاڑی لاک کی تھی لیکن میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ جرائم پیشہ قسم کے لوگ چابی کے بغیر بھی کسی گاڑی کا لاک کھول سکتے ہیں۔"

"میں رپورٹ میں پڑھ چکا ہوں کہ آپ کے ڈیڈی کی کار کون سی ہے۔ اس کا لاک جلدی نہیں کھولا جا سکتا۔"

"میں نے کہا نا کہ کار تو وہاں بہت دیر کھڑی رہی تھی اور پھر وہاں دوسری بہت سی گاڑیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس شخص کو دوسری گاڑیوں کی آڑ بھی حاصل رہی ہوگی۔ زیادہ وقت صرف کرنے میں شاید اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔"

"میں اس کار کی چابی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میرا پرس بیڈ روم میں ہے۔ چابی بھی اسی میں ہے۔ میں لے کر آتی ہوں۔" سمیرا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ آپ چابی میں کیا دیکھیں گے۔"

"آپ لے کر تو آئیے۔"

"اچھا۔ میں آتی ہوں۔"

سمیرا کے جانے کے بعد صمد یار خاں کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

سمیرا نے واپسی میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ایک چابی اس نے صمد یار خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجیے۔"

صمد یار خاں نے چابی کو اپنی ناک کے قریب لے جا کر دو تین بار سونگھا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" سمیرا تعجب سے بولی۔

"بعض جرائم پیشہ افراد صابن یا ایسی ہی کسی چیز پر کسی چابی کا نشان حاصل کرنے کے بعد دوسری چابی بنوا لیتے ہیں۔"

"لیکن ڈیڈی یہ چابی ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ صرف کل انہوں نے یہ مجھے دی تھی کیونکہ طبیعت کچھ ڈل ہونے کی وجہ سے وہ ڈرائیونگ نہیں کر سکتے تھے۔"

"شوفر ملازم نہیں رکھا تھا انہوں نے؟"

"جی نہیں۔ وہ کبھی بھی شوفر رکھنے کے حق میں نہیں رہے۔"

صمد یار خاں کچھ سوچتا ہوا چابی کی طرف دیکھنے لگا۔

سمیرا نے پوچھا "کیا آپ کو اس میں سے کسی قسم کی بو آئی ہے؟"

"نہیں۔" صمد یار خاں نے جواب دیا، پھر پوچھا "آپ کے پاس دوسری کار ہے؟"

"جی ہاں۔ گھر میں چار کاریں ہیں۔"

"آپ کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟ میرا مطلب ہے ملازمین کے علاوہ۔"

"اس وقت تو میرے علاوہ صرف ممی ہی ہیں۔ میری چھوٹی بہن سائرہ ایم بی اے کرنے کے لیے کل ہی لندن گئی ہے۔"

"آپ کی ممی بھی خود ہی ڈرائیو کرتی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تو کل وہ کیوں نہیں گئی تھیں جمشید خاں صاحب کے ساتھ؟"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سائرہ سے بہت پیار کرتی ہیں وہ۔ کل جب وہ گھر سے روانہ ہو رہی تھی، تبھی ممی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شام تک انہیں اچھا خاصا بخار ہو گیا تھا۔ اسی لیے ڈیڈی مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق اس تقریب میں ان کی شرکت بہت ضروری تھی۔"

"اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کی ممی کی۔"

"بخار تو انہیں اس وقت بھی ہے۔"

"کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟"

"کس سلسلے میں؟"

"اسی پوچھ گچھ کے سلسلے میں۔"

سمیرا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کیوں!" صمد یار خاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا "کیا اس میں کوئی حرج ہے؟"

"دراصل ممی کی طبیعت کی خرابی کے باعث میں ان سے ابھی تک ڈیڈی کے اغوا کی بات چھپائے ہوئے ہوں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ رات کو جب ہم لوٹے تھے تو وہ سو رہی تھیں اور صبح کسی خاص کام کی وجہ سے ڈیڈی ذرا جلدی چلے گئے ہیں۔"

"آپ یہ بات ان سے کب تک چھپا سکتی ہیں؟"

"کیا اس کا امکان نہیں کہ جلد از جلد ڈیڈی کا کچھ پتا چل جائے؟" سمیرا نے دل گرفتہ سی آواز میں کہا "آٹھ دس گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں ان کے اغوا کو۔"

"مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ان کے اغوا کا مقصد ہی سامنے نہیں آیا ہے۔ انہیں اغوا کرنے والوں نے اب تک نہ تو آپ لوگوں سے رابطہ کیا ہے، نہ کسی اور سے۔ ایسی صورت میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"میں تو سائرہ کی وجہ سے بھی پریشان ہوں۔ رات ایک بجے وہ لندن پہنچ گئی تھی۔ اس نے دو بجے فون کیا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ڈیڈی سو چکے ہیں پھر اس کا فون صبح آیا تھا تو میں نے جو بات ممی سے کہی تھی، وہی اس سے بھی کہہ دی۔"

"یعنی آپ کے ڈیڈی کسی کام کی وجہ سے ذرا جلدی چلے گئے ہیں۔"

"جی ہاں، لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کا فون پھر آ گیا تھا اور

اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈیڈی کے دفتر کے ڈائریکٹ نمبر کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن ریسیور نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس نے دفتر کی آپریٹر سے بات نہیں کی ورنہ اسے حقیقت معلوم ہو جاتی۔ میں نے اسے پھر یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ڈیڈی اپنے دفتر نہیں بلکہ کہیں اور گئے ہیں۔"

"آپ ان سے یہ بات کب تک چھپائیں گی؟"

"وہ ایک اجنبی دیس میں بہت پریشان ہو جائے گی۔"

"میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ انہیں بتا دیں۔ یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔ انہیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ڈیڈی کے ساتھ کیا ہو چکا ہے لیکن میں اس کے لیے اصرار نہیں کروں گا۔ یہ بہرحال آپ کا نجی معاملہ ہے، تاہم میں آپ کی ممی سے بہرحال بات کرنا چاہوں گا۔"

"آپ ان سے کیا معلوم کریں گے؟"

"آپ تو کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہیں جس سے آپ کے ڈیڈی کی ناچاقی ہو گئی ہو لیکن شاید آپ کی ممی کو اس کا علم ہو۔"

"اس طرح انہیں ڈیڈی کے اغوا کا علم ہو جائے گا۔"

"وہ انہیں ہونا ہی چاہیے۔"

سمیرا نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر کھڑی ہو گئی "چلئے۔ میں آپ کو ان کے کمرے میں لے چلتی ہوں۔ انہیں تو بخار کی حالت میں ڈرائنگ روم تک لانا مناسب نہیں ہو گا۔"

○☆○

نیلی آنکھوں والے نوجوان نے جمشید خاں کو کرسی سے بندھا ہوا چھوڑا اور کہیں چلا گیا۔ جمشید خاں بدستور خوف اور پریشانی کے حصار میں رہا۔ نیلی آنکھوں والے نوجوان نے اس سے جو کچھ بھی کہا تھا، اس کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔

انتظار کرتے کرتے جمشید خاں ہی کے اعصاب ٹوٹنے لگے تھے اور اس نے بابرہ طلعت کے مطالبے پر اس سے نکاح کر لیا تھا۔

نکاح میں وکیل اس کا ساتھی داور بنا تھا اور گواہ "کرائے کے دو آدمی بنے تھے۔ ان کا بندوبست داور ہی نے کیا تھا۔ کرائے ہی کے ایک بوڑھے شخص نے بابرہ طلعت کے باپ کا کردار ادا کیا تھا۔

بابرہ اس بات پر بھی مُصر رہی تھی کہ نکاح نامے میں اس کے باپ کا اصل نام لکھوایا جائے چنانچہ اس کی یہ بات بھی مانی گئی تھی۔

بابرہ طلعت کے اغوا کا کیس سال بھر پرانا ہو چکا تھا۔ پولیس اس کی فائل بند کر چکی تھی۔ اخبارات نے بھی عرصے سے اس کے بارے میں کچھ نہیں چھاپا تھا اس لیے نکاح پڑھانے والے قاضی کو اغوا ہونے والی بابرہ طلعت یاد نہیں آ سکتی تھی مگر جمشید نے احتیاطاً داور کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ قاضی پر نظر رکھے اور اگر وہ پولیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے تو اس کا "معقول بندوبست" کر دیا جائے۔

لالچی داور سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ جمشید خاں اس کے لیے "سونے کی چڑیا" تھا۔

قاضی کو اغوا ہو جانے والی بابرہ طلعت یاد نہیں آ سکی، پھر بھی جمشید خاں نے یہ فیصلہ کر ڈالا کہ اس نکاح کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہنا چاہیے چنانچہ اس کے ایما پر داور نے اسی رات قاضی کے گھر میں اس طرح آگ لگوا دی کہ نکاح کا رجسٹر اس آگ میں ضرور خاک ہو جائے اور کبھی کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ قاضی نے اس دن کس کس کا نکاح پڑھایا تھا لیکن اس آگ میں رجسٹر کے ساتھ وہ بے چارہ قاضی بھی خاکستر ہو کر رہ گیا۔

بابرہ طلعت اس وقت تک ان تمام باتوں سے بے خبر ہی رہی تھی اور رات کو اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ جمشید سے کہا تھا "کاش تمہیں مجھ سے سچی محبت ہوتی جمشید۔"

"مجھے تم سے سچی ہی محبت ہے بابرہ۔" جمشید نے ڈراما کیا تھا "وہ میری مجبوری تھی کہ میں تم سے فوری طور پر شادی نہیں کر سکتا تھا لیکن مرد کی وحشت بھی ایک چیز ہوتی ہے جانِ من۔ اسی وحشت نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں تمہیں اغوا کروا لوں لیکن تم نے مجھے ایک سال تک تڑپایا۔"

"اگر تم مجھ سے اسی وقت نکاح کر لیتے تو سال بھر نہ گزرتا۔ اب تو مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ اپنے گھر والوں کا سامنا کر سکوں۔ نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے وہ میرے بارے میں۔ شاید یہی سوچا ہو کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب میں کیا منہ لے کر ان کے سامنے جا سکتی ہوں۔"

"پریشان نہ ہو۔ کچھ دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟"

"میں کچھ دن میں اپنے گھر والوں کو اس پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ تمہیں اپنے گھر کی بہو کی حیثیت سے قبول کر لیں۔ اس کے بعد ہم تمہارے گھر والوں سے ملنے بھی چلیں گے۔"

"میں نے کہا نا کہ میں اب ان کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

"وہ تو کرنا ہی پڑے گا جانِ من۔ تمہارے دل سے ان کی یاد تو نہیں جا سکتی۔ اس کرب میں تم یہ پہاڑ سی زندگی کس طرح گزارو گی۔ تمہاری وہ اداسی میرے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہو گی۔"

"واقعی جمشید؟"

"آخر میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے واقعی تم سے محبت ہے۔"

"اگر تم ہمیشہ میرے رہے تو میں اپنے گھر والوں کو بھی بھلا دوں گی جمشید۔"

"اب نکاح کے بعد بھی تمہیں شبہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔"

"جن لوگوں کو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہوتا ہے، کیا ان کی شادی اسی طرح ہوتی ہے؟"

"میں تمہیں بتا تو چکا ہوں کہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ان مجبوریوں سے نکل کر میں اپنے گھر والوں کو سمجھالوں گا۔"

"اچھا۔" بابرہ طلعت نے ٹھنڈی سانس لی' پھر کچھ سوچ کر بولی "جب تک تمہاری مجبوریاں ختم نہیں ہوجاتیں' مجھے یہیں رہنا پڑے گا؟"

"ہاں بابرہ! یہ ایک الگ مجبوری ہے۔ میں یہاں سے تمہیں کہیں اور بھی لے جاؤں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ یہ مسئلہ تو اسی وقت حل ہوگا نا جب میں تمہیں اپنے گھر لے جاسکوں۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔ داور میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ ہر طرح سے تمہارا خیال رکھے گا۔"

"اور تم؟"

"میں تو یہاں مستقل نہیں رہ سکتا نا بابرہ! بس کل اور رک سکوں گا پھر مجھے اپنے شہر واپس جانا ہوگا لیکن جب تک مسئلہ طے نہیں ہوجاتا' میں یہاں کا چکر تو لگاتا رہوں گا۔ میں تمہیں بھول تو نہیں سکتا نا۔"

"کاش ایسا ہی ہو!" بابرہ طلعت کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے تھے۔

"وہ وقت آہی جائے گا جب تم میری محبت پر مکمل یقین کرنے لگوگی۔" جمشید خاں نے جیسے بڑے پیار سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا "آج ہماری زندگی کی بہت حسین رات ہے۔ اسے اپنے آنسوؤں سے افسردہ نہ کرو۔"

جمشید خاں کو محبت کا یہ ناٹک اس لیے رچانا پڑا تھا کہ بابرہ طلعت کے ساتھ کچھ دن اور گزار سکے۔ اس حسین لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بے تحاشا روپیا خرچ کیا تھا۔

وہ دس دس پندرہ پندرہ دن کے وقفے سے بابرہ کے پاس جاتا رہا پھر اسے ایک ایسا موقع ملا کہ اس نے نکاح نامے کی وہ کاپی غائب کردی جو بابرہ کے پاس تھی۔ جو کاپی خود اس کے پاس تھی' وہ اسے پہلے ہی جلا کر خاک کرچکا تھا۔ بابرہ کی کاپی حاصل کرنے کے بعد اس نے وہ بھی جلا ڈالی۔

بابرہ وہ کاپی غائب ہونے سے پریشان ہوگئی۔

جب اگلی مرتبہ جمشید خاں اس کے پاس پہنچا تو رات ہوچکی تھی۔

"آج بہت تھکا ہوا ہوں' تمہاری بانہوں میں ہی تھکن اتر سکے گی۔" اس نے بابرہ طلعت سے کہا تھا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ نکاح نامے کی وہ کاپی کہاں ہے جو میرے پاس تھی؟" بابرہ طلعت نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس کے بارے میں کیا معلوم ہوسکتا ہے!" جمشید خاں نے حیرت ظاہر کی۔

"تمہارے سوا اور کسی کو نہیں معلوم ہوسکتا۔" بابرہ طلعت اسے گھورتی رہی "پچھلی بار جب تم آئے تھے تو وہ میرے پاس تھی لیکن تمہارے جانے کے بعد وہ مجھے نہیں ملی۔"

"کہیں رکھ کر بھول گئی ہوگی۔ خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہو۔ سکون سے تلاش کرنا' مل ہی جائے گی۔"

"میری دنیا اس کمرے تک محدود ہے اور میں اس کمرے کو اس طرح چھان چکی ہوں جس طرح چھلنی سے کوئی چیز چھانی جاتی ہے۔ مجھے تم پر شبہ تو ہوتا تھا جمشید کہ نکاح کے بعد بھی تم مجھ سے محبت کا صرف ناٹک کھیل رہے ہو لیکن اب میرا وہ شبہ یقین میں بدل چکا ہے۔ تم ہی نکاح نامے کی وہ کاپی یہاں سے لے گئے ہو۔ تم ایسی کوئی چیز میرے پاس نہیں رہنے دینا چاہتے جس سے میں خود کو تمہاری بیوی ثابت کرسکوں۔"

"میرا موڈ خراب نہ کرو بابرہ۔ میں ویسے ہی بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل میں خود بھی تمہارے ساتھ وہ ڈھونڈوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی کمرے سے مل جائے گی۔ چلو اب آرام کرو' لیٹو آکر۔"

"میں اس وقت تک سکون سے نہیں لیٹ سکتی جب تک مجھے نکاح نامے کی کاپی نہ مل جائے۔"

"تو کیا ابھی ڈھونڈوں؟" جمشید خاں جھلا گیا۔

"ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ بتاؤ کہ وہ تم یہاں سے کیوں لے گئے ہو اور اب وہ کہاں ہے؟"

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔ اگر تم یہ فضول باتیں جاری رکھوگی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"اگر میرے نکاح نامے کی کاپی نہیں ملے گی تو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گی جمشید۔ میں تمہاری اور اپنی جان ایک کردوں گی۔" بابرہ طلعت نے وحشت زدہ انداز میں کہا اور تیزی سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف جھپٹی۔

جمشید خاں کو فوراً خیال آیا کہ بابرہ طلعت نے شیشے کے ٹکڑے شاید اب تک ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ چھوڑے ہیں۔ انہی ٹکڑوں کے بل پر اس نے جمشید خاں کو سال بھر تک اپنے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی وجہ پہلے بھی یہ نہیں تھی کہ شیشے کے وہ ٹکڑے اسے موت سے ڈراتے تھے اور اب بھی اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اسے ڈر صرف یہ تھا کہ وہ یا بابرہ ان ٹکڑوں سے زخمی بھی ہوگئے تو خاصی پریشانی ہوجائے گی۔ بابرہ طلعت کو وہ نہ اسپتال لے جاسکتا تھا' نہ اس کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلوا سکتا تھا اور اگر خود زخمی ہوجاتا تو بھی یہ اندیشہ رہتا کہ وہ کسی اسپتال کا رخ کرتا تو اس سے یہ بات پوچھی جاتی کہ وہ زخم اسے کس طرح لگے۔ اس طرح بات پولیس تک پہنچ سکتی تھی جس سے جمشید خاں ہر صورت میں بچنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس وقت بھی جب اس نے بابرہ طلعت کے تیور سنگین دیکھے تو بہت تیزی سے دروازے کی طرف گیا۔

"میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گی جمشید۔" جمشید خاں نے

بابرہ طلعت کی آواز اپنے خاصی قریب سنی تھی لیکن وہ تیزی سے دروازہ کھول کر نہ صرف باہر نکل گیا بلکہ اس نے دروازہ بند کرنے میں بھی بہت پھرتی دکھائی تھی۔

"جمشید!" بابرہ طلعت نے دروازہ پیٹ ڈالا۔

داور گھبرایا ہوا سا ادھر آیا "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"بیرونی کمرے میں چلو۔" جمشید خاں نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

بابرہ طلعت کی چیختی چنگھاڑتی آواز بیرونی کمرے تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن اتنی دھیمی کہ توجہ دینے پر ہی سنائی دیتی اور اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ اس کی چیخ وپکار باہر تک جا پاتی۔ اس کے لیے اس مکان کا ایک ایسا ہی کمرا منتخب کیا گیا تھا کہ اس کی چیخ و پکار مکان کے باہر کسی کے کان تک نہ پہنچ سکے۔

"اب مجھے اس کم بخت سے جان چھڑانا ہوگی۔" بیرونی کمرے کے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے جمشید خاں نے کہا۔

"تم اس سے نکاح کر چکے ہو جمشید۔" داور نے آہستہ سے کہا۔

"تو کیا ہوا۔" جمشید خاں نے اسے گھورا "تم جانتے ہو کہ وہ میں نے مجبوراً کیا تھا۔ اسی لیے اس نکاح خواں کا گھر بھی جلوا دیا تھا۔ اب اس نکاح کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہا ہے۔ نکاح نامے کی جو کاپی بابرہ کے پاس تھی، وہ بھی میں نے اس کے پاس نہیں رہنے دی ہے، بلکہ اب دنیا میں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ جو نکاح نامہ میرے پاس تھا، میں وہ بھی جلا کر خاک کر چکا ہوں۔"

داور نے سرہلایا "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس سے میری جان چھڑاؤ اب۔"

"مگر کس طرح؟"

"یہ سب سوچنا تمہارا کام ہے۔"

"ختم کروا دیا جائے اسے؟"

"ختم؟" جمشید خاں چونکا "یعنی.... قتل؟"

"ہاں۔"

"اتنا سنگین جرم تم کر سکو گے؟"

"پہلے بھی کروا چکا ہوں۔ وہ نکاح خواں بھی اپنے گھر کی آتش زدگی میں جل کر مر گیا تھا۔ وہ بھی تو ایک قتل ہی تھا لیکن اس قسم کے کام میں دوسروں سے کرواتا ہوں۔"

"کچھ بھی کرو یا کرواؤ۔ پیسے کی پروا مجھے پہلے بھی نہیں تھی، اب بھی نہیں ہے۔"

بابرہ طلعت سے جان چھڑانا جمشید خاں کے لیے بہت ضروری یوں تھا کہ چند دن میں اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہونے والی تھی جو ایک بہت بڑے سرمائے دار کی بیٹی تھی۔ جمشید خاں خود بھی ایک بڑے سرمائے دار کا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ سب کچھ اسی کا ہوتا اور اس لڑکی سے شادی کے باعث اس کے باپ کی دولت بھی اسی کی ہوتی کیونکہ وہ بھی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔

جمشید خاں دولت کا پجاری تھا۔ وہ بابرہ طلعت جیسی غریب لڑکی کو بیوی بنا کر اپنا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ ایسی لڑکیاں صرف اس کی بھینٹ چڑھتی تھیں۔ اپنے اس مزاج کے باعث وہ بے تحاشا اخراجات بھی کرتا تھا اور بابرہ طلعت کو حاصل کرنے کی ضد میں تو اس نے بہت ہی زیادہ اخراجات کر ڈالے تھے۔ اب وہ اس سے جان چھڑانے کے لیے بھی ہر حد تک جا سکتا تھا۔ اس کی منزل تو وہ بے پناہ دولت تھی جو بابرہ طلعت کو بیوی بنا کر اسے حاصل نہیں ہو پاتی۔

اس رات بھی وہ بابرہ طلعت کے پاس بس آخری بار ہی آیا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ داور سے اس کا کچھ بندوبست کرنے کے لیے کہتا۔ داور کی لالچی فطرت اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ صرف پیسے ہی کے لیے داور اس کا دوست بنا ہوا تھا اور پیسے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

"آج کی رات میں یہاں کے کسی ہوٹل میں گزار لوں گا۔" اس نے داور سے کہا "ایک اکاؤنٹ میرا یہاں کے ایک بینک میں بھی ہے۔ بابرہ سے جان چھڑانے کے لیے مجھے کتنی رقم خرچ کرنا ہوگی، وہ مجھے ابھی بتا دو۔ کل تمہیں رقم دے کر میں اس شہر سے چلا جاؤں گا۔"

○☆○

اس رات دروازہ پیٹ پیٹ کر بابرہ طلعت کے ہاتھ سرخ ہو گئے تھے، چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا تھا اور پھر وہ نڈھال حالت میں دروازے ہی سے ٹیک لگائے بہت دیر تک بیٹھی رہی تھی۔ ابتدا میں کچھ دیر تک اس کے آنسو بھی بہے تھے لیکن پھر آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔

شیشے کا وہ ٹکڑا جس سے وہ جمشید خاں پر وار کرنا چاہتی تھی، پہلے ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف جا گرا تھا اور اس کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے تھے۔

بابرہ طلعت کے خیال کے مطابق اب اسے شیشے کے اس ٹکڑے کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب جمشید خاں دوبارہ اس کے پاس نہیں آئے گا۔ وہ اس کے پاس سے نکاح نامے کی کاپی بھی غائب کر چکا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اس کی نیت میں کھوٹ تھا۔ نکاح کر لینے کے باوجود وہ اسے بیوی کی حیثیت سے اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بابرہ طلعت کھوئی کھوئی نظروں سے ایک طرف دیکھتی اور سوچتی رہی تھی کہ اس جیسی بے وقوف لڑکیوں کو تو پیدا ہوتے ہی مرجانا چاہیے۔ وہ اسے اپنی بے وقوفی ہی گردان رہی تھی کہ اس نے جمشید خاں جیسے سرمائے دار نوجوان سے محبت کی اور اغوا ہونے

سے پہلے تک یہ سمجھتی رہی کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا۔
اغوا ہونے کے بعد ہی اسے ہوش آیا تھا کہ وہ اس وقت تک غلط فہمی میں مبتلا رہی تھی۔ جمشید خاں اسے صرف اپنا کھلونا بنانا چاہتا تھا' یا اگر وہ اس کے سامنے بہت زیادہ گڑگڑاتی تو وہ اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھ لیتا لیکن بابرہ طلعت اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ توڑ کر ایک بڑے سے ٹکڑے کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا۔
"تم نکاح کیے بغیر میرے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے جمشید۔" وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی؟ اور اس طرح ایک سال گزر گیا تھا۔
ایک سال بعد جمشید خاں اس سے نکاح کے لیے تیار ہوگیا۔ نکاح کے وقت وہ قاضی کے سامنے ہنگامہ کرکے جمشید خاں سے نجات بھی حاصل کرسکتی تھی لیکن سال بھر بعد اس نے یہ بہت غنیمت جانا تھا کہ جمشید خاں اس سے نکاح کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ سال گزر جانے کی وجہ سے اس میں اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے گھر والوں کا سامنا کرتی۔ اس نے اپنے طور پر طے کرلیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے مرچکی تھی۔ ایسی صورت میں یہ بہت غنیمت تھا کہ جمشید خاں اس سے نکاح کے لیے تیار ہوگیا تھا۔
پھر نکاح کے بعد جمشید خاں کی باتوں نے اسے پھر غلط فہمی کا شکار کردیا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ مناسب وقت آنے پر وہ اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے گھر لے جائے گا لیکن جس روز اس نے نکاح نامہ غائب پایا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور اس نے جمشید خاں کی نیت سمجھ لی۔ وہ ایسا کوئی ثبوت نہیں رہنے دینا چاہتا تھا کہ وہ اس سے اپنا حق طلب کرسکتی۔
اور پھر جب وہ جمشید خاں کی آمد پر بپھری اور وہ بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہوگیا تو اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کی دنیا اندھیر ہوجانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی۔
اس مکان میں داور اس کا نگہبان تھا اور وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ وہ اب اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا۔
وہ کسی طرح بھی پیش آتا' بابرہ کو اب اس کی پروا نہیں رہ گئی تھی۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ خودکشی کرلے لیکن پھر دل میں امنڈتی ہوئی نفرت نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ زندہ رہے اور کم ازکم اس وقت تک خود کو ہلاکت میں نہ ڈالے جب تک جمشید خاں سے اپنی بربادی کا انتقام نہ لے لے۔
لیکن' وہ یہ بھی سوچتی رہی تھی کہ جمشید خاں سے انتقام لینا کیا اس کے لیے ممکن ہوگا؟ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ جمشید خاں کس شہر میں رہتا تھا۔ نکاح نامے کی جو کاپی اس کے پاس تھی' اس پر اس نے جمشید خاں کے باپ کا نام اور جمشید خان کے شناختی کارڈ پر لکھا ہوا اس کا پتا تو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا لیکن یہ بات یقینی نہیں تھی کہ جمشید خاں اب بھی اسی پتے پر رہتا ہو۔ اس کے ملک میں شناختی کارڈ بنے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ دوبارہ شناختی کارڈز بننے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور اس عرصے میں بہت سے لوگوں نے اپنی رہائش تبدیل کرلی تھی۔ خود بابرہ طلعت ہی ایک اور گھر میں رہتی تھی جب اس کا شناختی کارڈ بنا تھا لیکن اس کے چھ ماہ بعد ہی اس کے گھر والے کرائے کا وہ مکان چھوڑ کر' کرائے کے ایک اور مکان میں جا بسے تھے۔ اسی لیے وہ یہ اندازہ بھی لگا سکتی تھی کہ بہتوں نے اپنے شہر بھی چھوڑ دیے ہوں گے اور دوسرے شہروں میں جا بسے ہوں گے۔
بابرہ طلعت کو ایک امید بس یہ تھی کہ جمشید خاں کا باپ چونکہ ایک بڑا آدمی تھا اس لیے اگر اس نے اپنی رہائش بدل بھی دی ہوگی تو اس کی پرانی رہائش گاہ میں رہنے والوں سے اس کا نیا پتا معلوم ہوسکتا تھا۔
مگر ان سب خیالات کی تان اس سوال پر آکر ٹوٹتی تھی کہ وہ اس گھر کے قید خانے سے کس طرح نکل سکے گی اور داور اب اس سے کس طرح پیش آئے گا؟
ساری رات خیالات کے تانے بانے میں الجھتے ہوئے گزر گئی۔ اسے ایک منٹ کے لیے بھی نیند نہیں آسکی تھی۔ صبح جب کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ بستر پر تکیے کے سہارے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔
اندر آنے والا داور تھا۔ روزانہ ہی وہ اس کے لیے ناشتا لے کر آیا کرتا تھا۔ اس روز بھی اس کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی۔
اس روز بابرہ طلعت نے اس کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تبدیلی محسوس کی۔ وہ بہت سنجیدہ اور متفکر دکھائی دے رہا تھا۔
ناشتے کی ٹرے تپائی پر رکھنے کے بعد اس نے بابرہ طلعت کی طرف دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولا "میرا خیال ہے تم رات بھر سوئی نہیں ہو۔"
اس کے لہجے پر بابرہ طلعت کو تعجب ہوا۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔
"میں بھی رات بھر نہیں سو سکا ہوں۔" داور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جمشید کی نیت میں اتنا کھوٹ ہے کہ وہ تم سے نکاح کرلینے کے بعد بھی تمہیں اپنی بیوی نہیں سمجھے گا۔ اسے کمینے پن کی انتہا کے سوا کچھ نہیں سمجھا جاسکتا۔ مجھے تو کل تک یہی غلط فہمی رہی کہ وہ تمہیں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے تمہیں اغوا کرانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ یہی باور کرایا کہ کچھ مجبوریوں کے باعث وہ تم سے فوری طور پر شادی نہیں کرسکتا اور نکاح کے بعد بھی وہ مجھ سے اپنی مجبوریوں ہی کا رونا روتا رہا۔ اس کی بدنیتی تو کل رات میرے سامنے آئی۔"
بابرہ طلعت کا ذہن بری طرح الجھ گیا۔ وہ داور کی ان باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے بالکل قاصر رہی تھی۔

"ناشتا کرلو۔" داور نے کچھ رک کر کہا "میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا تو تم سے تفصیلی باتیں کروں گا۔ رات بھر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب میں جمشید کو اپنا دوست نہیں سمجھوں گا۔ اب مجھے تم اپنا ہمدرد سمجھو۔ آئندہ کے لیے تم اپنے بارے میں جو بھی فیصلہ کروگی' اس میں تمہیں میرا مکمل تعاون حاصل رہے گا۔"

پھر وہ چلا گیا تھا اور بابرہ طلعت دم بخود بیٹھی رہ گئی تھی۔

اس کے بعد داور دو گھنٹے بعد اس کمرے میں آیا۔ وہ ناشتے کی ٹرے پر ایک نظر ڈال کر بولا "تم نے ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا۔"

"جی نہیں چاہ رہا تھا کچھ زیادہ کھانے کو۔" بابرہ طلعت نے جواب دیا۔

داور کچھ رک کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا' پھر بولا "تم نے آئندہ کے لیے اپنے بارے میں کچھ فیصلہ کیا؟"

"میں حیران ہوں کہ اچانک تم اپنے دوست کے خلاف کیسے ہوگئے؟" بابرہ طلعت نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اب اس گھٹیا انسان کو تم میرا دوست نہ کہو۔ کل اس نے مجھے یہ بتا کر میری آنکھیں کھول دی ہیں کہ وہ تمہیں قتل کروادے گا۔"

"کیا!" بابرہ کانپ گئی۔

"ہاں۔" داور نے بتایا "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آج شام اندھیرا پھیلنے کے بعد تک یہاں تمہارا خیال رکھوں اور پھر یہاں سے چلا جاؤں۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد دو پیشہ ور قاتل یہاں آجائیں گے جو تمہیں قتل کردیں گے۔"

بابرہ کا جسم سنسنانے لگا۔

داور نے کچھ رک کر کہا "اب تمہیں اپنے بارے میں جلد از جلد کچھ فیصلہ کرنا ہے۔ شام سے پہلے پہلے تمہیں اس مکان سے نکل جانا چاہیے۔"

"مجھے تمہاری یہ باتیں عجیب سی لگ رہی ہیں۔" بابرہ طلعت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں؟"

"تم نے اپنے دوست کی خاطر مجھے اغوا کروانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اور اب تم اس کے اتنے مخالف ہوگئے ہو۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں نے تمہیں اغوا کروایا تھا۔ جمشید نے اپنے پیسے کے بل پر یہ کام کچھ جرائم پیشہ افراد سے کروایا تھا۔ اس نے میری ڈیوٹی تو صرف یہ لگائی تھی کہ میں یہاں تمہارا خیال رکھوں اور تم یہاں سے فرار نہ ہونے پاؤ۔"

بابرہ طلعت اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ داور کی بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔

داور نے کچھ رک کر کہا "تمہیں مجھ پر اسی وقت یقین آسکتا ہے جب میں تمہارے کسی کام آؤں گا۔ مجھے بتاؤ بابرہ کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں جمشید کے گھر جانا چاہتی ہوں۔" بابرہ طلعت نے کہا۔

"وہ اس شہر میں نہیں رہتا۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔"

"تم اس کے شہر جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"مگر کیوں؟ اب اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟ تم یہ کس طرح ثابت کرسکو گی کہ تم اس کی بیوی ہو۔ وہ تو نکاح نامے کی کاپی بھی تمہارے پاس سے غائب کرچکا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم!" بابرہ طلعت نے چونک کر کہا۔

"کل رات اسی نے سب کچھ بتایا تھا۔ انہی سب باتوں سے تو میں نے سمجھا کہ وہ اتنا کمینہ شخص ہے جس کی دوستی پر اب مجھے لات ماردینی چاہیے۔"

بابرہ طلعت غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی' پھر بولی "کل رات تک بلکہ آج صبح تک مجھے بھی یہی خیال تھا کہ میں خود کو اس کی بیوی ثابت نہیں کرسکتی لیکن جب تم ناشتا رکھ کر گئے ہو' اس کے بعد میرے دماغ میں آیا ہے کہ میں خود کو اس کی بیوی ثابت کرسکتی ہوں۔"

"کیسے؟"

"جس قاضی نے ہمارا نکاح پڑھایا تھا' اس سے نکاح نامے کی فوٹو اسٹیٹ لی جاسکتی ہے۔"

"نہیں لی جاسکتی۔" داور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جس دن تم دونوں کا نکاح ہوا تھا' اسی رات قاضی صاحب کے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ قاضی صاحب بھی اس آگ میں جل کر مرگئے اور نکاح ناموں کا رجسٹر بھی!..... میں نے اس رات تو اس آگ کو اتفاقیہ ہی سمجھا تھا لیکن کل رات سے سوچ رہا ہوں کہ وہ آگ بھی جمشید ہی نے لگوائی ہوگی۔ اس کی نیت میں شروع ہی سے کھوٹ تھا۔ پہلے اس نے آگ لگوا کر وہ ریکارڈ ضائع کروایا اور اس کے بعد نکاح نامے کی وہ کاپی بھی غائب کردی جو تمہارے پاس تھی۔"

بابرہ طلعت کو اپنا دل ڈوبتا سا لگا۔ اسے روشنی کی جو کرن اچانک نظر آئی تھی' وہ بھی اندھیرے میں ڈوب گئی۔

"خیر!" بابرہ طلعت نے کچھ دیر بعد کہا "میں اس کے شہر جاکر اس سے ملوں گی تو ضرور۔"

"کیا تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس نہیں جانا چاہتیں؟"

"اب کیا منہ لے کر جاؤں گی ان کے پاس۔"

"جمشید کے پاس جاکر بھی کیا کروگی؟"

"کچھ نہ کچھ تو کروں گی۔" بابرہ طلعت نے سوچتے ہوئے کہا تھا "تم مجھے اس کے گھر تک تو پہنچاؤ۔"

"میں تمہیں اس کے شہر تک تو پہنچا سکتا ہوں لیکن اس کے گھر تک نہیں پہنچا سکتا۔"

"کیوں!"

"میں اس کے گھر کبھی نہیں گیا۔ اس نے مجھے کبھی اپنے گھر بلایا ہی نہیں۔"

بابرہ طلعت نے ناقابلِ یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھا' پھر بولی "تم اس کے کیسے دوست تھے کہ اس کا گھر بھی کبھی نہیں دیکھا۔"

"شاید میں اس کا دوست پہلے بھی نہیں تھا۔" داور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میری کچھ مجبوریاں ہیں جن کو میں نے دوستی کا نام دے لیا تھا۔"

"کیا مطلب!"

"میں ایک غریب آدمی ہوں بابرہ۔ برسوں سے ملازمت کی تلاش میں رہا ہوں۔ جمشید سے میرے تعلقات اس وقت ہوئے جب میرا ضمیر شاید مردہ ہو چکا تھا۔ میں اس کے پیسے کے سہارے اپنی زندگی گزارنے لگا غالباً جمشید کو بھی اس کا احساس تھا للذا اس نے دوستی کے نام پر مجھے اپنا غلام بنائے رکھا لیکن کل رات اس کی جو کمینگی میرے سامنے آئی ہے اس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب مجھے اس کی پروا نہیں کہ میں مستقبل میں کتنے دن تک اپنا پیٹ بھر سکوں گا اور کب مجھے فاقے کرنا پڑیں گے۔"

اس وقت بھی بابرہ طلعت کا ذہن الجھا ہی رہا۔ اس کا دل داور کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا' لیکن پھر اس نے سوچا کہ اگر داور اسے اس مکان سے نکال کر جمشید کے شہر تک پہنچا سکے' تبھی اس پر مکمل یقین کیا جا سکتا ہے۔

"تم مجھے جمشید کے شہر تک تو پہنچا دو۔" وہ بولی۔

"اس کے لیے میں تیار ہوں لیکن اگر تم خود کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ سفر برقع پہن کر ہی کرنا ہوگا۔"

"برقع تم لا کر دو گے؟"

"ظاہر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں برقع پہن کر سفر کر لوں گی۔"

"دوسری بات یہ کہ ہمیں ٹرین سے سفر کرنا ہوگا۔ میرے پاس اتنا روپیا نہیں ہے کہ میں ہوائی سفر کے اخراجات برداشت کر سکوں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ میں نے بہت کم سفر کیے ہیں لیکن ٹرینوں ہی میں کیے ہیں۔ میرے گھر والوں کے پاس اتنا پیسا نہیں تھا کہ ہوائی سفر کیے جا سکتے۔"

"اب ایک آخری بات اور۔"

"وہ کیا!"

داور خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار تھے۔

"بولو!" بابرہ طلعت نے کچھ رک کر کہا۔

"دیکھو۔" داور نے متذبذب انداز میں کہا "راستے میں ہمیں کوئی غیر متوقع صورتِ حال بھی پیش آ سکتی ہے۔ کسی کو ہم پر شک بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں...." وہ پھر چپ ہو گیا۔

"بات تو پوری کرو۔"

"ایسی صورت میں ہمیں مجبوراً یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔"

"اوہ!" بابرہ طلعت کے منہ سے نکلا۔

"میری نیت پر کوئی شک نہیں کرنا۔" داور نے نظریں جھکا کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" بابرہ طلعت نے ایک طویل سانس لی "مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"بس تو پھر میں ابھی بازار سے ایک برقع لے کر آتا ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ۔" بابرہ طلعت نے سوچتے ہوئے کہا "جمشید کا گھر ڈھونڈنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ ہم اس شہر میں جا کر ٹھہریں گے کہاں؟ کیا تمہارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ہم کسی چھوٹے موٹے ہوٹل میں ٹھہر سکیں۔"

"اس کی تم کوئی فکر نہ کرو۔ وہاں میرا ایک اور دوست بھی ہے لیکن وہ جمشید جیسا دوست نہیں ہے۔ میری طرح وہ بھی عرصے تک بے کار رہنے کے بعد سال بھر سے برسرِ روزگار ہوا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں اب بھی اکیلا ہی رہتا ہے۔ ہم اس کے یہاں ٹھہر سکتے ہیں لیکن اس سے بھی یہی کہنا پڑے گا کہ ہم میاں بیوی ہیں۔"

"جب میں اس کے لیے تیار ہو ہی چکی ہوں تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ بات تمہارے دوست سے کہنا پڑے یا کسی اور سے۔"

"بس تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ تمہاری خاطر یہ سب کچھ کر کے میرے دماغ کا خاصا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

اس کے بعد داور برقع خریدنے چلا گیا۔

○☆○

پچیس سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی بابرہ طلعت کو وہ سارے واقعات اس طرح یاد تھے جیسے وہ سب کچھ کل ہی کی بات تھی۔ ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے ماضی کی وہ ساری باتیں اس کے دماغ میں چکرا رہی تھیں۔ بار بار اس کی نظر ٹیلی فون کی طرف بھی اٹھ رہی تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کی کال کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھکن محسوس کرنے لگی تو ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

پچیس سال بعد بھی اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ برقع اوڑھ کر اس مکان سے نکلی تھی اور داور کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچی تھی۔

ٹرین کے سفر میں اس کی طبیعت کچھ خراب ہونے لگی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے متلی ہوتی اور اسے کھڑکی سے سر نکال کر تھوکنا پڑتا۔

اٹھارہ گھنٹے کے سفر نے اسے بری طرح نڈھال کردیا۔ جب وہ داور کے ساتھ اسٹیشن پر اتری تو اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر داور نے اس سے دھیمی آواز میں کہا "میں اپنے دوست کے گھر تمہیں بعد میں لے جاؤں گا۔ پہلے یہ ضروری ہے کہ تمہیں کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔ تمہاری طبیعت خاصی خراب معلوم ہورہی ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھے ہوا کیا ہے۔ پہلے بھی میں ٹرین کے دو تین سفر کرچکی ہوں۔ کبھی مجھے متلی نہیں ہوئی۔"

"یہ متلی ٹرین کے سفر کی وجہ سے تو شاید نہیں ہے۔"

"پھر؟"

"مجھے شبہ ہے کہ تم ماں بننے والی ہو۔"

"کیا!" بابرہ طلعت کو اچھا خاصا ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے ابکائی بھی آئی اور اس نے برقع کی نقاب تھوڑی سی سرکا کر ایک طرف تھوکا۔

"دیکھا تم نے۔" داور بولا "اب تو تم ٹرین کا سفر نہیں کررہی ہو۔ اب تمہیں متلی کیوں ہورہی ہے؟"

"پتا نہیں۔" بابرہ طلعت کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے سے سب پتا چل جائے گا' اور یہ ضروری ہے کہ جب تمہیں ڈاکٹر کو دکھایا جائے تو میں تمہیں اپنا شوہر ظاہر کروں۔"

بابرہ طلعت چپ رہ گئی۔

پھر جب لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو داور کے شبے کی تصدیق ہوگئی۔ بابرہ طلعت دو ماہ کے حمل سے تھی۔

"لیکن متلی تو مجھے کل شام سے ہوئی ہے۔" بابرہ طلعت نے کہا۔

"ایسا ہوتا ہے بی بی!" لیڈی ڈاکٹر نے کہا "بعض لڑکیوں کو تو فوراً ہی متلی شروع ہوجاتی ہے اور بعض کو کئی ماہ گزرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ بعض کو تو ہوتی ہی نہیں ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے اسے کچھ دوائیں دیں اور مشورہ دیا کہ وہ کسی میٹرنٹی ہوم سے رابطہ قائم کرلے۔

لیڈی ڈاکٹر کے کلینک سے نکل کر داور نے ٹیکسی ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتایا جہاں اس کے دوست کا گھر تھا۔ وہ ٹیکسی اس نے ریلوے اسٹیشن ہی سے کی تھی اور جتنا وقت کلینک میں لگا تھا' اتنی دیر وہ ٹیکسی کلینک کے سامنے کھڑی رہی تھی۔

اس احساس نے بابرہ طلعت کے دل ودماغ کی عجیب حالت کردی کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ ایک ایسے بچے کی ماں جس کا باپ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا لیکن بابرہ طلعت نے اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا۔ وہ بہرحال کسی ناجائز بچے کی ماں نہ بنتی۔

اپنے خیالات سے وہ اس وقت چونکی جب داور نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "اس گلی کے آخری مکان کے سامنے روک دینا۔"

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ بابرہ طلعت کو وقت کا خیال آیا تو اس نے داور سے کہا "تمہارا دوست اکیلا رہتا ہے تو اس وقت اس کے گھر پر تالا پڑا ہوا ہوگا۔"

"نہیں۔" داور نے کہا "میں نے اسے کل ٹیلی گرام دے دیا تھا۔ اس نے آج اپنے دفتر سے چھٹی کی ہوگی۔ وہ ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔"

بابرہ طلعت چپ ہوگئی۔

داور کے دوست کا نام اشتیاق تھا۔ وہ واقعی اپنے گھر پر ان کا انتظار کررہا تھا۔

جب ان کا مختصر سا سامان ایک کمرے میں رکھ دیا گیا تو اشتیاق نے شکایتی لہجے میں کہا "یار داور! مجھے تم سے یہ شکایت ہمیشہ رہے گی کہ تم نے مجھے اپنی شادی کی اطلاع تک نہیں دی۔"

"بس کیا بتاؤں اشتیاق! سب کچھ ہنگامی طور پر ہوگیا تھا۔"

بابرہ طلعت نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اسے دل ہی دل میں اس بات پر رونا سا آرہا تھا کہ وہ بیوی تو کسی اور کی تھی لیکن لیڈی ڈاکٹر کے بعد اب ایک اور شخص کے سامنے بھی وہ خود کو داور کی بیوی ظاہر کرنے پر مجبور تھی۔

اشتیاق نے ان دونوں کے لیے ایک کمرا ٹھیک کردیا تھا۔ داور بابرہ طلعت کو اس کمرے میں لے گیا "اب تم کچھ دیر آرام کرلو تاکہ تمہاری طبیعت کچھ سنبھل جائے پھر نہا دھو کر کپڑے بدل لوگی تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگوگی۔"

بابرہ طلعت نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ اس کا سارا جسم ٹوٹا جارہا تھا۔ دو گھنٹے آرام کرنے سے اس کی حالت کافی سنبھل گئی پھر غسل کرنے کے بعد جب اس نے کپڑے تبدیل کیے تو داور کے خیال کے مطابق وہ خاصا بہتر محسوس کرنے لگی۔ متلی تو اسے اب بھی ہورہی تھی لیکن لیڈی ڈاکٹر کی دواؤں کی وجہ سے پہلے جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی۔

داور نے اس سے کہا "اشتیاق اکیلا رہتا ہے اس لیے کھانا ہوٹلوں ہی میں کھاتا ہے اور ناشتا تک خود نہیں بناتا لیکن اب وہ بازار گیا ہے تاکہ سب سامان خرید لائے۔ آج تو ہم لوگ بازار ہی کا کھانا کھائیں گے لیکن کل سے کھانا تمہیں تیار کرنا پڑے گا۔ میں نے اشتیاق سے کہہ دیا ہے کہ ہم کچھ عرصے اسی کے گھر میں رہیں گے۔ یہ میں نے اس خیال سے کہا ہے کہ جمشید کی تلاش میں نہ جانے کتنا عرصہ لگے۔ تم نے مجھے اب تک یہ نہیں بتایا ہے کہ تم اسے کس طرح تلاش کروگی۔"

"اس کا پتا یاد ہے مجھے۔"

"کیسے۔" داور نے تعجب سے کہا۔

"نکاح نامے پر اس کا جو پتا لکھا تھا' وہ میں نے یاد کرلیا تھا۔ قاضی صاحب نے وہ پتا اس کے شناختی کارڈ سے لکھا تھا اس لیے وہ

غلط تو نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تو تم نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔" داور نے خوشی کا اظہار کیا "مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تو ہم اسے آسانی سے تلاش کرلیں گے۔ مجھے اس کا پتا لکھوادو۔ اب تو شام ہوگئی ہے۔ کل میں اس کا گھر دیکھ آؤں گا تو پھر تمہیں بھی وہاں پہنچا دوں گا لیکن یہ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا ہے کہ تم اس سے مل کر اس سے کیا کہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں اپنی بیوی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا اور تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے نہیں کہ خود کو اس کی بیوی ثابت کرسکو۔"

"بس مجھے اس کے گھر تک پہنچادو' پھر میں جانوں اور میرا کام! یہ تمہارا احسان ہوگا مجھ پر۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تمہارے کسی کام آکر میں اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں۔"

بابرہ طلعت نے اسے وہ پتا لکھوا دیا جو اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔

رات کو اشتیاق بازار سے کھانا لے آیا جو ان تینوں نے مل کر کھایا۔ کھانے کے ذرا دیر بعد بابرہ طلعت کے ساتھ داور بھی کمرے میں آگیا اور رازدارانہ انداز میں بولا "اشتیاق کو یہی بتایا گیا ہے تاکہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اس لیے ہم دونوں ہی کو اسی کمرے میں سونا پڑے گا لیکن اس وجہ سے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنا بستر دروازے کے قریب لگائے لیتا ہوں۔"

اس نے بابرہ طلعت کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنا یہ بندوبست کر بھی لیا۔

بابرہ طلعت کو خاصی حد تک داور کے خلوص پر اس لیے یقین آگیا تھا کہ وہ اسے جمشید کے شہر تک لے آیا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ اسی کمرے میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور یہ بات یقینی نہیں سمجھی جاسکتی تھی کہ اس شخص کے وجود میں شیطانیت ہرگز نہیں جاگے گی۔ وہ بہرحال ایک مرد تھا۔

نہیں' بابرہ طلعت نے یہ خیالات اپنے ذہن سے جھٹکے۔ داور کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں آسکتا۔ جب وہ اپنے شہر کے ایک مکان میں قید تھی اور جمشید اسے چھوڑ کر جاچکا تھا تو وہ اسی کے رحم و کرم پر تھی۔ جب اس وقت اس نے کسی بدنیتی کا ثبوت نہیں دیا تو اب بھی ایسا نہیں ہوگا۔

اس طرح بابرہ طلعت نے اپنی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تھی مگر اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکی۔ جب بھی اس پر غنودگی طاری ہوتی' اس کا لاشعور اسے چونکا دیتا۔ چونک کر وہ دروازے کی طرف دیکھتی اور داور کو بے خبر سوتا ہوا پاتی۔

اسی طرح وہ رات گزر گئی اور صبح ہوجانے کے بعد بابرہ طلعت نے سوچا کہ وہ خواہ مخواہ داور کی طرف سے ایک بے بنیاد خوف میں مبتلا رہی تھی۔

صبح ناشتا کرنے کے بعد اشتیاق اپنے دفتر چلا گیا تو داور نے بابرہ طلعت سے کہا "اب میں جمشید کا گھر تلاش کرنے جاتا ہوں۔ تم میری واپسی تک دوپہر کا کھانا پکالو۔"

"یہاں کے لوگوں نے ہم دونوں کو اس گھر میں آتے دیکھ تو لیا ہوگا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اشتیاق آس پاس کے جن لوگوں سے کچھ مراسم رکھتا ہے' ان سے وہ کہہ چکا ہے کہ اس کا ایک دوست اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہے اور کچھ دن اس کا مہمان رہے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ دروازہ بند کرلو۔"

داور چلا گیا تو بابرہ طلعت باورچی خانے کا رخ کرنے کے بجائے کمرے میں پہنچی۔ وہ اب تک ایک الجھن میں پڑگئی تھی۔ اس شہر میں آنے سے پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ اگر جمشید نے اسے اپنی بیوی تسلیم نہیں کیا تو وہ کسی طرح اسے بھی جان سے مار دے گی اور خود کو بھی ہلاک کرلے گی لیکن جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے' اس کا ارادہ متزلزل سا ہونے لگا تھا۔ اس کے دل میں ماں بننے کی ہوک اٹھنے لگی تھی۔ بار بار اس کے دل میں یہ خیال ابھر رہا تھا کہ وہ ماں بننے کے بعد ہی جمشید سے ملنے جائے۔ ممکن ہے کہ اس بچے ہی کی وجہ سے جمشید اسے اپنی بیوی ماننے کے لیے تیار ہوجائے۔

وہ خاصی دیر تک ان خیالات سے الجھتی رہی' پھر گھڑی پر نظر پڑی تو چونکی۔ اسے کھانا تیار کرنا تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھی اور باورچی خانے کا رخ کیا۔

داور ڈھائی بجے کے قریب لوٹا۔ وہ خاصا تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

"اتنی دیر لگادی۔" بابرہ طلعت بولی "میں تو اب پریشان ہونے لگی تھی۔"

"بہت سے لوگوں سے پوچھ گچھ میں اتنا وقت گزر گیا۔ دراصل جمشید اس پتے پر نہیں رہتا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔"

بابرہ طلعت نے ایک طویل سانس لی "یہ خیال تو مجھے تھا کہ شاید وہ لوگ اب اس گھر میں نہ رہتے ہوں لیکن جو لوگ بھی اب اس گھر میں رہتے ہوں' ان لوگوں سے معلوم تو ہوسکتا ہے کہ اب جمشید اور اس کے والد کہاں رہتے ہیں۔ جمشید کسی معمولی آدمی کا بیٹا تو نہیں جس کا حالیہ پتا وہاں رہنے والوں کو معلوم نہ ہو۔"

"ان لوگوں کو کچھ نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں غلط پتا یاد رہ گیا ہوگا۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہے۔" داور نے پُراعتماد لہجے میں کہا "جو پتا تم نے مجھے بتایا تھا وہ گھر کسی بڑے آدمی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ تو دو سو گز کا ایک مکان ہے جہاں متوسط طبقے کا ایک گھرانا آباد ہے اور ان

لوگوں کا کہنا ہے کہ اس گھر میں ان سے پہلے کسی کی رہائش ممکن ہی نہیں۔ تیس سال پہلے ان لوگوں نے وہ مکان خود بنوایا تھا۔"

بابرہ طلعت داور کا منہ تکتی رہ گئی پھر اس نے پُرجوش لہجے میں کہا "میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھ سے پتا یاد رکھنے میں غلطی نہیں ہوئی۔"

"تو پھر یہی بات سوچی جاسکتی ہے کہ نکاح سے پہلے جمشید نے اپنا ایک جعلی شناختی کارڈ بنوالیا ہوگا۔ ہمارے یہاں یہ کام بہت ہوتا ہے۔"

"تمہاری دوستی اس سے کہاں ہوئی تھی؟"

"اسی شہر میں۔" داور نے جواب دیا "لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے اس کا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"اگر اس نے جعلی شناختی کارڈ بنوالیا تھا تو بھی اس کا پتا تو لگایا جاسکتا ہے۔ بڑے لوگوں کی کچھ شہرت تو ہوتی ہے۔"

"اگر کوئی دولت مند ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مشہور بھی ہوگا۔ نہ جانے کتنے کروڑپتی اس شہر میں ایسے ہوں گے جنہیں صرف ایک خاص حلقے میں جانا پہچانا جاتا ہوگا۔ عام لوگوں سے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔"

بابرہ طلعت پریشان ہوگئی۔ یہ نکتہ تو اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا جو داور نے اسے سمجھایا تھا۔

"ایک بات اور بھی ہوسکتی ہے۔" داور نے کہا "ہوسکتا ہے وہ اس شہر میں رہتا ہی نہ ہو۔"

"کیوں۔" بابرہ طلعت چونکی "وہ تم سے اسی شہر میں ملا کرتا تھا نا؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تمہارے شہر بھی تو جاتا رہتا تھا۔ ممکن ہے اسی طرح وہ یہاں بھی آتا رہتا ہو۔ شاید اس نے اپنا گھر بھی مجھے اس لیے نہ دکھایا ہو کہ اس شہر میں اس کا گھر ہو ہی نہیں۔"

داور کی اس بات نے بابرہ طلعت کو اور پریشان کردیا۔

"اب اس کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔" داور پھر بولا۔

"میں اسے تلاش کرکے رہوں گی۔" بابرہ طلعت نے پُرجوش لہجے میں کہا "میں ملک کے سارے شہروں کی خاک چھانوں گی۔"

"لیکن اس میں بہت عرصہ تو یقیناً لگ جائے گا۔"

"اب تو میں مرتے دم تک اس کی تلاش جاری رکھوں گی۔"

"اب تو؟" داور نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہاں۔" بابرہ طلعت نے کہا "اب تو میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ اس بچے کو اپنا باپ ملنا ہی چاہیے۔"

"تم جذباتی ہورہی ہو۔ اب تو تمہیں اس بوجھ سے نجات حاصل کرلینا چاہیے۔"

"کس بوجھ سے؟" بابرہ طلعت نے چونک کر پوچھا۔

"یہاں ایسی کئی لیڈی ڈاکٹرز مل جائیں گی جو اس قسم کے غیر قانونی کام کرتی ہیں۔ خرچ کی تم پروا نہ کرو۔ میں سب بندوبست کرلوں گا۔"

بابرہ طلعت اس کا مطلب سمجھ گئی "نہیں۔" وہ پھر پُرجوش انداز میں بولی "میں اپنا بچہ ضائع نہیں کرواؤں گی۔"

"اس طرح زندگی کو کب تک گھسیٹا جاسکتا ہے؟"

"اس سلسلے میں تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھ پر تمہارا یہی احسان بہت ہے کہ تم نے مجھے جمشید کے پیشہ ور قاتلوں کے ہاتھوں مرنے سے بچالیا۔ اب میں تم پر مزید بوجھ نہیں بنوں گی۔ جب تک جمشید نہیں مل جاتا' میں ملازمت کرکے زندگی گزار لوں گی۔"

"اچھی طرح سوچ لو۔ یہ آسان نہیں ہوگا۔"

"آسان ہو یا مشکل۔ میرا فیصلہ یہی ہے۔"

"کل تک اور سوچ لو۔"

"کل تک؟.... کیوں؟.... کل کیا ہوجائے گا؟"

"اگر تم اپنے اس جذباتی فیصلے پر قائم رہیں تو مجھے بھی کچھ سوچنا پڑے گا نا۔"

"کیا سوچو گے تم؟ یہی نا کہ اب اپنی راہ لوگے اور مجھے زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دوگے؟"

"نہیں۔" داور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر تم اپنے فیصلے پر قائم رہتی ہو تو میں بچے کی پیدائش تک تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔ اگر میں نے تمہیں ابھی سے بے سہارا چھوڑ دیا تو بچے کی پیدائش ہی تمہارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔"

بابرہ طلعت نے سوچا کہ داور کی بات غلط نہیں تھی۔

"اچھا اب کھانا نکالو۔" داور نے کہا "بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

بابرہ طلعت خاموشی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس کے بعد بابرہ طلعت کے شب و روز کھوئے کھوئے سے انداز میں گزرنے لگے۔ داور نے اس سے بچے کے موضوع پر دوبارہ کوئی گفتگو نہیں کی۔ دو تین دن بعد داور نے اشتیاق کے ساتھ جانا شروع کردیا۔ بابرہ طلعت سے اس نے کہا تھا کہ اشتیاق اسے ملازمت دلانے کی کوششیں کررہا ہے پھر ایک ماہ بعد اس نے بابرہ کو بتایا کہ اسے ملازمت مل گئی ہے۔

پانچ ماہ گزرنے کے بعد داور نے بابرہ طلعت سے کہا "اب تم کسی میٹرنٹی ہوم سے رابطہ کرلو۔ عین وقت پر تو مشکل ہوجاتی ہے۔"

"کئی دن سے میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" بابرہ طلعت نے نظریں جھکا کر کہا "لیکن میٹرنٹی ہوم میں شاید ثبوت بھی دینا پڑے گا کہ میں شادی شدہ ہوں۔"

"مجھے اس بات کا خیال شروع ہی سے تھا اس لیے میں نے کچھ ایسے تعلقات بنالیے ہیں کہ ایک میٹرنٹی ہوم میں کسی ثبوت

کے بغیر ہی تمہارا داخلہ ہوجائے گا۔ بس اتنا ہوگا کہ وہاں بھی تمہارے شوہر کی حیثیت سے مجھے ہی سامنے آنا ہوگا۔"

"نہیں۔" بابرہ طلعت نے سخت لہجے میں کہا "میں یہ تو برداشت کرسکتی ہوں کہ کسی مجبوری کی صورت میں خود کو تمہاری بیوی ظاہر کروں لیکن اس معاملے میں یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں!"

"اس طرح میٹرنٹی ہوم کے ریکارڈ پر یہ بات آجائے گی کہ اس بچے کے باپ تم ہو۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"لیکن مجھے ہے۔ میرے بچے کے نام کے ساتھ اس کے اصل باپ کا نام آنا چاہیے۔"

"یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب جمشید مل جائے اور تمہیں اپنی بیوی بھی تسلیم کرلے۔"

بابرہ طلعت چپ رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ داور کی بات کے جواب میں کیا کہے۔

پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بابرہ طلعت کی تکلیف میں بتدریج اضافہ شروع ہوا اور ایک روز داور نے اس سے کہا "اس طرح تو تم سسک سسک کر' تڑپ تڑپ کر مر بھی سکتی ہو۔"

"مجھے مرجانا گوارا ہے لیکن میں اپنے بچے کو اس کے باپ کے سوا کسی کا نام ہرگز نہیں دوں گی۔"

"تو پھر ایک یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ کسی دائی کا بندوبست کرلیا جائے۔ دائیوں کو بچے کے باپ کے نام سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جب تک خود اس بچے کا نام رجسٹر نہ کرایا جائے' کچھ بھی ریکارڈ پر نہیں آتا۔"

یہ بات بابرہ طلعت کے ذہن میں بھی آچکی تھی لیکن داور سے یہ بات کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہوسکی تھی۔ اس سے پہلے بھی جب بچے کے معاملے میں داور سے اس کی کوئی بات ہوئی تھی' اس نے شدید حجاب محسوس کیا تھا اور تنہائی میں دیر تک روتی بھی رہی تھی کہ اس کے بچے کا باپ کہیں موجود ہے لیکن وہ اس معاملے میں "ایک غیر شخص" سے باتیں کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔

بابرہ طلعت کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھتے ہوئے داور نے ایک دائی کا بندوبست کرلیا۔

○☆○

بابرہ طلعت جس وقت ماضی کے ان خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی' اسی وقت سمیرا انٹیلی جنس آفیسر صدیار خاں کو اس کمرے میں لے گئی تھی جہاں پینتالیس سالہ مسز قدسیہ جمشید بستر پر آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی تھی مگر جاگ رہی تھی۔

جمشید خاں کے اغوا سے باخبر ہوتے ہی مسز قدسیہ جمشید کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ یک لخت بستر سے اٹھ بیٹھی حالانکہ اسے اس وقت بھی بخار تھا۔

"مسز جمشید!" صدیار خاں نے آہستہ سے کہا "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے آپ کی بیماری کی حالت میں آپ کو یہ اطلاع دی لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی...!" صدیار خاں نے سمیرا کی طرف دیکھا "مجھے ایسی کوئی بات بتانے سے قاصر رہی ہیں جس سے مجھے آپ کے شوہر کا سراغ لگانے میں کچھ مدد مل سکے۔ اگر ان کے اغوا کا مقصد محض تاوان حاصل کرنا ہوتا تو وہ لوگ اب تک اس سلسلے میں رابطہ کرچکے ہوتے لیکن ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس کا مطلب میرے خیال میں یہی ہے کہ ان کے اغوا کا مقصد تاوان حاصل کرنے کے بجائے کچھ اور ہے۔"

مسز قدسیہ جمشید پھٹی پھٹی آنکھوں سے سمیرا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے تفکرات کے حصار میں وہ ایسی بند ہوئی تھیں کہ انہوں نے صدیار خاں کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔

"تم نے مجھ سے اب تک یہ بات چھپائے رکھی۔" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولیں۔

"میں بہت پریشان ہوگئی تھی ممی۔" سمیرا نے نظریں جھکا کر کہا "رات سے اب تک میں سو بھی نہیں سکی ہوں۔ بستر پر لیٹنے کا خیال تک نہیں آیا ہے مجھے۔ میں نے اپنی اس دماغی کیفیت میں یہی بہتر سمجھا تھا کہ آپ کو نہ بتاؤں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوجائے۔"

"کب تک چھپاتیں مجھ سے۔" مسز قدسیہ جمشید نے غصیلی آواز میں کہا۔ ان کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی تھی۔

"پلیز مسز جمشید!" صدیار خاں بولا "آپ اتنی جذباتی ہوجائیں گی تو آپ کی طبیعت پر اس کا برا اثر پڑے گا۔"

مسز جمشید نے اب بھی اس کی بات نہیں سنی یا ان سنی کردی اور سمیرا کو گھورتی ہوئی بولیں "جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

"ممی!" سمیرا روہانسی ہوگئی "میں نے سوچا تھا کہ پولیس شاید جلد ہی کوئی سراغ لگالے اور ڈیڈی کو بازیاب کرلے۔ اس کے بعد آپ کو بتایا جاتا تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

"سائرہ کو بھی لندن اطلاع دی یا نہیں؟" مسز جمشید کا غصہ کم نہیں ہورہا تھا۔

صدیار خاں نے ان سے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن سمیرا بول پڑی "میں نے اسے بھی نہیں بتایا ہے ممی۔ اس کے بارے میں بھی میں نے اسی طرح سوچا تھا کہ وہ ایک اجنبی دیس میں پریشان نہ ہوجائے حالانکہ وہ ہر گھنٹے بعد فون کررہی ہے۔ وہ ڈیڈی سے بات کرنا چاہتی ہے لیکن میں اسے ٹالتی رہی ہوں۔"

"کس طرح ٹالتی رہی ہو؟"

سمیرا نے وہی سب کچھ بتادیا جو صدیار خاں کو بتا چکی تھی۔

مسز جمشید خاں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا "اس طرح وہ اور پریشان ہوگئی ہوگی۔"

"آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے بتا دوں تو اب بتا دوں گی۔ دس پانچ منٹ میں اس کا فون آنا ہی چاہیے۔"

مسز جمشید اسے غصیلی نظروں سے دیکھتی رہیں، پھر چونکتے ہوئے انداز میں صمد یار خاں کی طرف متوجہ ہوئیں "آپ نے شاید بتایا تھا کہ آپ انٹیلی جنس کے افسر ہیں۔"

"جی۔"

"اور آپ لوگ اب تک میرے شوہر کا پتا نہیں لگا سکے ہیں۔"

"ہم لوگ جادوگر نہیں ہوتے ہیں مسز جمشید۔" صمد یار خاں کے لہجے میں کچھ تلخی تھی "دھیرے دھیرے ہی کسی معاملے کا سراغ لگتا ہے۔ ابھی تک ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ اسی لیے میں نے آپ کی بیماری کو نظرانداز کرتے ہوئے آپ کو تکلیف دینا ضروری سمجھا۔ آپ شاید مجھے کوئی ایسی بات بتا سکیں جس سے آپ کے شوہر کا سراغ لگانے میں کچھ آسانی ہو سکے۔"

"میں کیا بتا سکتی ہوں۔"

"میں نے ابھی بتایا تھا کہ ہمارے اندازے کے مطابق یہ اغوا برائے تاوان کا کیس نہیں ہو سکتا ورنہ وہ لوگ اب تک اس سلسلے میں رابطہ کر چکے ہوتے۔"

"وہ ان سے زبردستی چیک تو سائن کروا سکتے ہیں۔"

"آپ کی بیٹی کل رات پولیس کو بیان دے چکی ہیں کہ وہ اپنے نجی اکاؤنٹ کی چیک بک ہر وقت اپنے پاس رکھا کرتے تھے لہٰذا صبح ہی ان کے بینک سے رابطہ کر لیا گیا تھا۔ ہمارا آدمی مسلسل اس بینک میں موجود ہے۔ اگر کوئی آپ کے شوہر کا چیک کیش کروانے پہنچے گا تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ مجھے اب تک ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک کوئی بھی ان کا چیک کیش کرانے بینک نہیں پہنچا۔"

"تو پھر انہیں کیوں اغوا کیا گیا ہے؟" مسز جمشید کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"یہی معلوم کرنا ہے مجھے۔ اس قسم کے معاملات کا ایک پہلو دشمنی بھی ہوتا ہے۔ آپ کی بیٹی سے بھی میں یہ سوال کر چکا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو وہ اس سے بے خبر ہیں۔ اب میں آپ سے بھی یہی سوال کروں گا کہ آپ کے شوہر کی کسی سے ناچاقی تو نہیں ہو گئی تھی؟"

"اتنی طویل زندگی میں کسی نہ کسی سے ناچاقی تو ہو ہی جاتی ہے۔"

"ایسی ناچاقی جو دشمنی کا روپ دھار لے۔ آپ کے شوہر ایک بڑی کاروباری شخصیت ہیں۔ کسی سے کاروباری مخالفت زیادہ بڑھ جائے تو وہ بھی دشمنی کی بنیاد بن جاتی ہے۔"

"مجھے تو انہوں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں بتائی کہ ان کی کسی سے دشمنی ہو گئی ہے۔"

"اس وقت آپ کا ذہن خاصا پراگندہ ہو گیا ہو گا۔ اگر آپ اپنے شوہر ہی کی خاطر کچھ پُرسکون ہونے کی کوشش کریں تو شاید آپ کو ایسی کوئی بات یاد آ جائے جس سے مجھے کسی قسم کی مدد مل سکے۔"

"میں کیسے پُرسکون ہو سکتی ہوں۔" مسز جمشید کے ہونٹ کانپنے لگے "میرے شوہر کے اغوا کو اتنا وقت گزر چکا ہے۔ خدا جانے اب تک ان پر کیا بیت گئی ہو۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ زندہ ضرور ہوں گے۔ اگر کسی کو انہیں قتل کرنا ہی مقصود ہوتا تو انہیں ان کی کار میں ہی گولی مار دی جاتی۔ ان کو اغوا نہیں کیا جاتا۔"

"اگر تاوان حاصل کرنا مقصد نہ ہو تو کسی کو کیوں اغوا کیا جا سکتا ہے؟" مسز جمشید نے پوچھا۔

"کئی مقصد ہو سکتے ہیں۔ مغوی سے کوئی ایسا کام کروانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے جو وہ... کرنا نہ چاہتا ہو۔"

"اس کے لیے تو تشدد بھی کیا جاتا ہو گا۔" مسز جمشید نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" سمیرا نے چونک کر پوچھا۔

باہر سے ملازم کی آواز آئی۔ اس نے بتایا کہ لندن سے فون آیا ہے۔

سمیرا نے مسز جمشید کی طرف دیکھ کر کہا "سائرہ کا فون ہو گا۔ میں اس سے بات کر کے آتی ہوں۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"آپ کے کمرے میں فون کیوں نہیں ہے؟" صمد یار خاں نے پوچھا۔

"میری طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میرے شوہر نے ہٹوا دیا تھا تاکہ میں لوگوں سے بات چیت کرنے کے بجائے مکمل آرام کر سکوں۔"

سمیرا اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکی۔ وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

ٹیلی فون سائرہ ہی کا تھا۔ اس مرتبہ سمیرا نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

سائرہ غصے سے چیخی "اب تک مجھ سے یہ کیوں چھپایا گیا؟" اس کی آواز کچھ رندھ سی گئی تھی۔

سمیرا نے اسے وہی جواب دیا جو مسز جمشید کو دے چکی تھی۔

"میں جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرتی ہوں۔" سائرہ نے کہا۔

"نہیں سائرہ! تم...." سمیرا نے اسے سمجھانا چاہا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے انتظار کر لے لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سمیرا نے خود اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ سائرہ نے پریشانی میں یا جان بوجھ کر ریسیور ٹھیک سے کریڈل پر نہیں رکھا ہوگا اس لیے انگیج کی ٹون آرہی تھی۔

سمیرا ٹھنڈی سانس لے کر تیزی سے واپس مسز جمشید کے کمرے کی طرف بڑھی۔

وہ دروازے پر پہنچی تھی کہ صدیار خاں تیزی سے باہر آیا "مس جمشید! جلدی سے ڈاکٹر کو فون کر دیجیے۔"

"کیا ہوا؟" سمیرا نے گھبرا کر پوچھا۔

"اس خیال سے ان کی طبیعت ایک دم کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہے کہ آپ کے ڈیڈی پر تشدد نہ کیا جا رہا ہو۔"

○☆○

وہ اتنی خوف ناک صورتِ حال سے دوچار تھا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

اس کے جسم پر کوٹ نہیں تھا۔ صرف قمیص، پتلون اور ویسٹ کوٹ تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ہو چکی تھی۔ قمیص کی آستینیں اس طرح پھٹی ہوئی تھیں جیسے جانوروں نے نوچا کھسوٹا ہو۔ اس کی گردن سے کوئی ایسی چیز چپکی ہوئی تھی جو کسی غیر ارضی مخلوق کا ہاتھ معلوم ہوتی تھی۔ لنگوروں اور بن مانسوں جیسی مخلوقات اس پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اذیت سے اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں اس طرح اوپر چڑھ گئی تھیں کہ پتلیاں نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔

وہ کسی غیر ارضی مخلوق کا ہاتھ تھا یا کوئی اور چیز لیکن وہ اس کی گردن میں پیوست نظر آرہی تھی اور اس کے سارے جسم میں برقی رو دوڑا رہی تھی۔ وہ برقی روئیں اس کے ہاتھوں سے خارج ہوتی ہوئی بھی نظر آرہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں کے کھلے ہوئے حصوں اور چہرے پر ایسی سفید لکیریں بھی کھنچی ہوئی تھیں جیسے اذیت سے اس کی ساری رگیں اور نسیں ابھر آئی ہوں جن میں خون بالکل نہ رہا ہو۔

ناقابلِ برداشت اذیت نے اس کی چیخوں کو بھی بہت خوف ناک بنا دیا تھا۔ پس منظر کی موسیقی سے وہ سب کچھ بہت ہی زیادہ خوف ناک بن گیا تھا۔

"بند کرو اسے!" جمشید خاں چیخ پڑا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

نیلی آنکھوں والے نوجوان نے ریموٹ استعمال کر کے ٹیلی ویژن اور وی سی آر بند کر دیے۔

"کیا تم خوف ناک فلمیں نہیں دیکھتے جمشید خاں!" نیلی آنکھوں والے نے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔

جمشید خاں کچھ نہیں بولا۔ اس کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

"مجھے تو یہ فلم بہت پسند ہے۔" نیلی آنکھوں والا پھر بولا "اس فلم کو دیکھتے ہوئے میری حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی جیسی تمہاری ہوگئی ہے۔ اگر یہ تمہارے لیے اتنی ہی ناقابلِ برداشت تھی تو تم نے یہ دو تین منٹ تک بھی کیوں دیکھی؟ شاید تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ تم مضبوط اعصاب کے انسان ہو لیکن تمہارے اعصاب نے تین منٹ میں ہی جواب دے دیا۔"

جمشید خاں کچھ نہیں بولا۔ اس کے لیے وہ فلم واقعی بہت خوفناک تھی۔ وہ اس قسم کی فلمیں کبھی دیکھتا ہی نہیں تھا۔

نیلی آنکھوں والے نے آگے بڑھ کر جمشید خاں کے سر سے ہیڈ فون اتار لیا۔ اس ہیڈ فون کی "پن" ٹیلی ویژن سے منسلک تھی۔

نیلی آنکھوں والے نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ اس وڈیو فلم کی خوف ناک آوازیں اس کمرے سے باہر نہ جا سکیں۔

"اب کیا کہتے ہو جمشید خاں۔"

جمشید خاں نے نیلی آنکھوں والے کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں اور اسے گھورنے لگا "کیا مطلب!"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ یہ فلم میں نے تمہیں کیوں دکھائی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"اس فلم میں جو کچھ اس شخص کے ساتھ ہو رہا تھا، وہی میں تمہارے ساتھ بھی کر سکتا ہوں، اگر تم بابرہ طلعت سے اپنی شادی کا اعتراف نہیں کرو گے۔"

"میں ایک بے بنیاد بات کا اعتراف کیوں کروں گا۔"

"بات تو بے بنیاد نہیں ہے جمشید خاں!"

"میں بابرہ طلعت نام کی کسی لڑکی کو جانتا تک نہیں ہوں۔"

"پھر تم برسوں تک داور کے ہاتھوں بلیک میل کیوں ہوتے رہے؟"

اس وقت جمشید خاں کو یہ کوشش کرنا پڑی تھی کہ نیلی آنکھوں والا اس کے چہرے پر اس کے چونکنے کا تاثر نہ بھانپ سکے۔ اس نے بڑی کوشش سے اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں داور نام کے کسی آدمی کو بھی نہیں جانتا، اور نہ میں کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہوا ہوں۔"

"تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں جو اس فلم میں ایک شخص کے ساتھ ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔"

"تمہاری یہ باتیں مجھے بالکل نہیں ڈرا سکتیں۔"

نیلی آنکھوں والا نوجوان دھیرے سے ہنس پڑا "تم تو اس فلم ہی کو دیکھ کر ڈر چکے ہو۔"

"میں ایسی فلمیں دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تو پھر سوچو کہ اگر تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوگا تو تم پر کیا بیتے گی؟"

"اچھا!" جمشید خاں نے طنزیہ انداز میں کہا "کیا تمہارے پاس بھی اس قسم کی بلائیں موجود ہیں؟"

"ایسی بلائیں تو نہیں میرے پاس لیکن تمہارا ایسا حشر کر سکتا

ہوں کہ تم خود کو ایسی ہی بلاؤں میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگو۔"
نوجوان نے کہا اور آگے بڑھ کر جمشید خاں کے پیچھے چلا گیا۔

جمشید خاں نے سر گھما کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی کرسی کے پائے کسی طرح فرش میں اس طرح جڑ دیے گئے تھے کہ وہ بالکل حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کرسی سے بندھے ہوئے جمشید خاں کو لگ بھگ دس گیارہ گھنٹے ضرور ہو چکے تھے اس لیے اب اسے اپنے ہاتھ پیر سُن ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔

کمرے میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔

نیلی آنکھوں والا نوجوان ایک ٹرالی کو دھکیلتا ہوا اس کے سامنے لے آیا۔ اس ٹرالی پر اذیت رسانی کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اس قسم کے آلات کی تصویریں جمشید خاں نے کسی رسالے میں دیکھی تھیں اور پڑھا بھی تھا کہ ان آلات سے کس طرح کام لیا جاتا ہے اور وہ کسی بھی انسان کے لیے کتنے اذیت ناک ہوتے ہیں۔

"دیکھا تم نے جمشید خاں!" نیلی آنکھوں والے نوجوان نے کہا "اذیت رسانی کے یہ جدید ترین آلات ہیں۔ ہٹلر کی گسٹاپو کے پاس بھی ایسے خوف ناک آلات نہیں تھے۔ ان سے میں تمہاری وہی حالت کر سکتا ہوں جو اس فلم میں تم اس آدمی کی دیکھ چکے ہو۔"

جمشید خاں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں لیکن اس نے اپنے ہونٹ بڑی سختی سے بھینچ لیے۔

"لیکن مجھے بہت زیادہ عجلت نہیں ہے۔" نیلی آنکھوں والے نوجوان نے ٹرالی کھڑی کر کے کہا "میں نے یہ سب کچھ تمہارے سامنے اس لیے کر دیا ہے کہ تم یہ سب کچھ دیکھو اور فیصلہ کرو کہ تم ان آلات کا مزہ چکھنا پسند کرو گے یا حقیقت کا اعتراف کرو گے۔ سوچنے کے لیے میں تمہیں آدھا گھنٹا دے سکتا ہوں۔ تنہائی میں اچھی طرح سوچ لو۔ میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا۔"

جمشید خاں کچھ نہیں بولا اور نیلی آنکھوں والا نوجوان اس کمرے سے چلا گیا۔

○☆○

صوفے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے بابرہ طلعت اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جھپٹ پڑنے والے انداز میں ریسیور اٹھایا اور بولی "ہیلو!" لیکن یہ وہ فون نہیں تھا جس کی وہ منتظر تھی۔ کسی سے غلط نمبر مل گیا تھا۔ بابرہ طلعت نے جھنجلا کر ریسیور، کریڈل پر پٹخ دیا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے اسی صوفے پر بیٹھ گئی جس پر کال ریسیو کرنے سے پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں ایک طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ماضی پھر اس کے ذہن میں چکرانے لگا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ ماں بنی تھی۔ اس وقت کی اذیت کا احساس اسے اب بھی یاد تھا۔ شاید وہ دائی ہی اپنے فن کی ماہر نہیں تھی یا شاید اس اذیت کا سبب یہ تھا کہ وہ پہلی بار ماں بنی تھی۔

اس اذیت نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

پھر جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے خود کو اشتیاق کے گھر میں نہیں پایا تھا۔ وہ اسے کسی اسپتال کا کمرا محسوس ہوا تھا۔ داور اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو گئی۔ وہ بہت نقاہت محسوس کر رہی تھی۔

"لیٹی رہو۔" داور بولا "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ کسی میٹرنٹی ہوم میں داخلہ لے لو۔ پہلے بچے کی پیدائش پر دائی زیادہ کامیاب نہیں رہتی۔ اس کی وجہ سے تمہاری زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اسی لیے میں تمہیں یہاں لانے کے لیے مجبور ہوا۔ تمہیں آٹھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا ہے۔ تمہیں دو ڈرپ لگائی جا چکی ہیں اور تین چار انجکشن الگ سے بھی دیے جا چکے ہیں۔ اب سے آدھے گھنٹے پہلے لیڈی ڈاکٹر تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر اس کمرے سے گئی ہے۔ اس کا یہ خیال بھی ٹھیک ثابت ہوا ہے کہ تمہیں آدھے گھنٹے میں ہوش آ جائے گا۔ میں اس وقت سے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

"میرا بچہ کہاں ہے؟" بابرہ طلعت نے بے چینی سے پوچھا۔

داور نے افسردگی سے سر جھکا لیا "اس کی تدفین کی جا چکی ہے۔ تم نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔"

"نہیں۔" بابرہ طلعت چیخ پڑی "یہ نہیں ہو سکتا۔"

"میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا بابرہ۔"

بابرہ طلعت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا کہ وہ ایک ہنستے کھلکھلاتے بچے کی ماں نہیں بن سکی تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ جب وہ ایک بچے کی ماں بننے کے بعد جمشید کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گی تو وہ اسے اپنی بیوی تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن اس کی یہ سوچ اب ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔

"صبر کرو۔" داور نے اسے تسلی دی "خدا کو یہی منظور تھا۔"

بابرہ طلعت صبر کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

داور بولا "لیڈی ڈاکٹر نے کہا ہے، جب تک وہ اجازت نہ دے، تم بستر سے نہ اٹھنا۔"

بابرہ طلعت کچھ نہیں بولی۔ چار دن تک اس نے اس ہدایت پر عمل بھی کیا۔ لیڈی ڈاکٹر صبح شام اسے دیکھنے آتی تھی۔ چار دن تک اسے طاقت کے انجکشن دیے جاتے رہے۔ داور نے اس کی خوراک کا خاص خیال رکھا۔ پھل وغیرہ اس کے کمرے میں موجود رہتے تھے، شروع میں اس کا جی تو نہیں چاہا تھا کچھ کھانے کو لیکن پھر داور کی ایک بات اس کے دل کو لگ گئی تھی۔

داور نے کہا تھا "اگر تم جلد از جلد تندرست نہ ہوئیں تو جمشید

کو کس طرح تلاش کرو گی؟"

پھر چوتھے دن لیڈی ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا "اب تم کمرے میں چہل قدمی کر لیا کرو تو کوئی حرج نہیں۔ چند دن بعد تم یہاں سے جا بھی سکتی ہو۔"

پھر لیڈی ڈاکٹر کے جانے کے بعد داور نے اس سے کہا "لیکن اس کمرے سے نہ نکلنا۔"

"کیوں!" بابرہ طلعت چونکی۔

"لیڈی ڈاکٹر نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی اور دیکھے۔ تمہیں جس حالت میں یہاں لایا گیا تھا' اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ میں خود کو تمہارا شوہر ثابت کرتا جو میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایسے کیسز میں لیڈی ڈاکٹرز پولیس کو باخبر کر دیتی ہیں لیکن ایک معقول رقم دے کر میں نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ یہی سمجھی ہے کہ تم نے کسی ناجائز بچے کو جنم دیا ہے اس لیے وہ نہیں چاہتی کہ یہاں تم پر کسی اور کی نظر پڑے۔"

بابرہ طلعت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اسے اپنے ساتھ قدرت کا ظلم سمجھ رہی تھی کیونکہ اس نے کسی ناجائز بچے کو جنم نہیں دیا تھا۔ وہ قطعی بے گناہ تھی مگر کیونکہ اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتی تھی لہٰذا وہ وہی سب کچھ کرنے کے لیے مجبور تھی جو اس سے کہا جا رہا تھا۔

چند دن میں اس کی حالت اور سنبھل گئی۔ اس ہفتے میں داور اسی کمرے میں رہا تھا لیکن بعد میں وہ چلا گیا۔ البتہ روزانہ اس سے ملنے آتا رہا۔ اس کی صحت بہتر ہو چکی تھی مگر داور اسے مزید علاج کے بہانے وہیں رہنے پر مجبور کرتا رہا اور اس طرح تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔

"اب تم غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لو۔" داور نے اس سے کہا "پھر ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔"

باتھ روم اس کمرے سے منسلک ہی تھا۔ بابرہ طلعت نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کر لیے۔ اس کی صحت اب ٹھیک ہو گئی تھی لیکن چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی' صحت مندی سے ختم نہیں ہو جاتی۔ اتنی جلدی یہ صدمہ فراموش کر دینا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک مردہ بچے کی ماں بنی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" داور نے گھڑی دیکھ کر اس سے کہا تھا "ہم اندھیرا پھیلنے کے بعد عقبی دروازے سے باہر نکلیں گے۔"

بابرہ طلعت بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا تھا۔

"اب آئندہ کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے؟" داور نے اس سے پوچھا۔

"میں ہر قیمت پر جمشید کو تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ یہ تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"تم شہر شہر اسے ڈھونڈتی پھرو گی تو کیا تمہیں ہر شہر میں ملازمت بھی ملتی رہے گی؟"

بابرہ طلعت چپ رہ گئی۔ اس پہلو پر اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

داور پھر بولا "میں دفتر سے چھٹی لے کر ایک ہفتے تک تمہارے ساتھ کلینک میں تو رہ گیا لیکن کیا یہ میرے لیے ممکن ہے کہ میں خالی جیب تمہارے ساتھ شہر شہر گھومتا رہوں؟ اور اگر تم اکیلی جاؤ گی تو مجھے یقین ہے کہ تم غلط قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاؤ گی جو تمہارا نہ جانے کیا حشر کریں۔"

بابرہ طلعت کپکپا گئی۔ داور کی بات غلط نہیں تھی۔

"اسی لیے میں نے ایک بات سوچی ہے۔" داور نے کہا "تمہاری عمر زیادہ نہیں ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ تم ماں بھی بن چکی ہو۔ تم اپنی خوب صورتی سے اتنا روپیا کما سکتی ہو کہ شہر شہر گھومنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب!" بابرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم اتنی بچی بھی نہیں ہو کہ تم نے میرا مطلب نہ سمجھا ہو۔"

"داور!" بابرہ طلعت اسے غصے سے گھورنے لگی "اگر تم نے اتنے عرصے تک میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو میں اس وقت تم سے بہت بری طرح پیش آتی۔ مت بھولو کہ میں ایک شخص کی جائز بیوی ہوں اور میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔"

"لیکن اگر تم نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو یہ دنیا تمہیں گندگی کا ڈھیر بنا دے گی۔"

"میں...." بابرہ طلعت ایک دم چپ ہو گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس صورت میں وہ خودکشی کر لے گی لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ ایسا تو وہ ہرگز نہیں کرے گی' جمشید سے انتقام لیے بغیر وہ خود کو ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

دوسری طرف داور کی تجویز بھی اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی لیکن یہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ پھر اس کے لیے کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔

"تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔" داور بولا۔

"میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" بابرہ طلعت نے کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے میں بہت سختی ہو لیکن اس کے لہجے میں سختی نہیں آپائی تھی۔

اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا اس نے لاشعوری طور پر سمجھ لیا تھا کہ اگر وہ جمشید سے انتقام لیے بغیر خودکشی نہیں کرنا چاہتی تو پھر اسے داور ہی کی بات ماننا پڑے گی۔

"اچھا۔" داور ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا "میں ڈاکٹر کو بتا آؤں کہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔"

بابرہ طلعت سوچ میں ڈوبی ہوئی خاموش بیٹھی رہی۔

داور اٹھ کر گیا اور دو منٹ بعد ہی واپس بھی آگیا۔ لیڈی ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ تھی۔

"میں نے انہیں ایک نسخہ دے دیا ہے۔" وہ داور کی طرف

اشارہ کر کے بولی "وہ طاقت کے انجکشن ہیں۔ ایک دن چھوڑ کر لگواتی رہنا۔ ایک انجکشن میں تمہیں ابھی لگا دیتی ہوں۔"

وہ انجکشن بابرہ طلعت کی نس میں لگایا گیا۔ دوا کی آدھی ہی مقدار اس کے جسم میں پہنچی تھی کہ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ کیسا انجکشن ہے ڈاکٹر۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔"

"کیا تکلیف محسوس ہو رہی ہے؟"

"نہیں، لیکن...."

"تو پھر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا دیر میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

بابرہ طلعت کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے جسم میں لذت انگیز سا سرور پھیلتا جا رہا ہو۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ بولی "یہ.... یہ کیا ہے..... داور! ..... کیا اس دوا میں کوئی.... نشہ آور...." وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ اس کی زبان میں لکنت آگئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو۔"

بابرہ طلعت کھڑی ہوئی تو ڈگمگائی۔ وہ گر ہی پڑتی اگر داور نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔ اس کی پنڈلیوں میں پھیلی ہوئی سنسناہٹ بھی سرور انگیز تھی۔ داور اسے سنبھالے ہوئے دوسرے دروازے سے نکلا تو بابرہ طلعت نے خود کو کسی گلی کے بجائے ایک راہداری میں پایا۔ داور اسے اس راہداری کے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہ ایک سجی ہوئی خواب گاہ تھی۔

میٹرنٹی ہوم میں ایسی خواب گاہ؟ بابرہ طلعت نے سوچا لیکن پھر اس سے زیادہ نہ سوچ سکی۔ اس کا دماغ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی کرسی پر بیٹھا نظر آیا تھا لیکن وہ اس کی موجودگی کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچ سکی۔ اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے جسم میں ایک آگ سی دہکنے لگی تھی۔ ایک ایسی آگ جو اس کے وجود کو نہیں بلکہ جذبات کو بھڑکا رہی تھی۔

داور اسے آرام دہ بستر پر لٹا کر کمرے سے چلا گیا۔

بابرہ طلعت کی آنکھیں بند ہونے لگیں پھر وہ یکایک اس وقت چونکی جب اس نے کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اسے ایک چہرہ کچھ دھندلایا ہوا سا نظر آیا اور وہ لمس ایسا تھا کہ بابرہ طلعت کے جسم میں جیسے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اسے ایک ایسی "طلب" محسوس ہوئی جس کا تجربہ اسے جمشید کی بیوی بن کر بھی نہیں ہوا تھا پھر وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسا خواب جو اسے سرشاری کی بلندی کی طرف لے جا رہا تھا۔

پھر اس بلندی سے نیچے آتے آتے اسے نیند آگئی۔

جب وہ جاگی تو صبح ہو چکی تھی۔ اس کی نظر کمرے میں لگی ہوئی گھڑی کی طرف گئی تو اسے معلوم ہوا کہ صبح کے دس بج چکے تھے۔ وہ بہت دیر تک سوتی رہی تھی۔ اب وہ اس کیفیت میں بھی نہیں تھی جو اس پر انجکشن نے طاری کی تھی۔ اس کے ہوش و حواس پوری طرح بحال تھے۔ اس نے اپنی حالت سے اندازہ لگایا کہ داور نے جو کچھ چاہا تھا' اس کی تکمیل ہو چکی تھی اور اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے داور اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔

○☆○

جمشید خاں کی نظریں ایذا رسانی کے آلات پر جمی ہوئی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ نیلی آنکھوں والے نوجوان کو اس کی زندگی کے حقائق کا علم بابرہ طلعت یا داور کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتا۔

داور نے اسے اتنا بڑا دھوکا دیا تھا جس کی اسے بالکل توقع نہیں تھی۔ اس نے بابرہ طلعت کا نام و نشان مٹا دینے کے لیے داور کو ایک خاصی بڑی رقم دی تھی اور اپنے شہر لوٹ آیا تھا پھر چند دن بعد ہی اس کی شادی قدسیہ سے ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں ایک مرتبہ داور نے اس سے فون کر کے صرف اتنا کہا تھا...."کام ہو گیا۔"

اس کے بعد داور کافی عرصے تک اس سے ملنے بھی نہیں آیا۔ جمشید خاں کو اب اس کی خواہش بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے ملنے آئے۔ اس نے اسے صرف اپنی مطلب براری کے لیے اپنا ساتھی بنایا تھا' اسے اپنا دوست کبھی نہیں سمجھا تھا۔

چھ ماہ بعد جمشید خاں کے والد کا انتقال ہو گیا تھا تو وہ خاصی دولت اور ایک بڑے کاروبار کا مالک بنا۔ اس کے بعد وہ اس کا منتظر رہا کہ کب قدسیہ کے باپ کا انتقال ہو اور کب مزید دولت اور قدسیہ کے باپ کا کاروبار بھی اس کے حصے میں آئے۔ اپنی عادت کے مطابق اس کی عیاشانہ زندگی کے معمولات میں اگر کوئی فرق آیا تھا تو صرف اتنا کہ اب کاروبار سنبھالنے کی وجہ سے اسے دوسرے شہروں کا رخ کرنے کی مہلت نہیں ملتی تھی' لیکن وہ سب کچھ اسے قدسیہ سے چھپا کے کرنا پڑتا تھا۔ اگر بات کھل جاتی اور قدسیہ اس سے طلاق لے لیتی تو اسے قدسیہ کے باپ کی دولت اور کاروبار سے محروم ہو جانا پڑتا۔

اس کی شادی کو ایک سال گزرا تھا جب اس وقت وہ چونک پڑا جب داور ایک صبح اس کے دفتر میں پہنچ گیا۔

"تم!" جمشید کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"کیوں!" داور مسکرایا "اپنے پرانے دوست کو دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"خوشی کیوں نہیں ہو گی۔" جمشید خاں نے جلدی سے کہا "لیکن تم اتنے عرصے تک غائب رہو تے کہ میں تمہیں اچانک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ تم یہ ملک ہی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہو۔"

"نہیں۔ دراصل میں نے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اس میں اتنا زیادہ الجھا کہ تم سے ملنے کے لیے آنے کا وقت ہی نہیں نکال سکا' لیکن افسوس کہ شدید محنت کے باوجود میرا وہ کاروبار

مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔"
"اوہ!" جمشید خاں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"ایسے برے وقت میں انسان کو اپنے دوست ہی یاد آتے ہیں' اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"
"اتنی بڑی رقم؟" جمشید خاں چونکا۔
"تمہارے لیے تو یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے جمشید۔ یہ تو خیر میں جانتا ہوں کہ ملک میں تیسرا مارشل لا لگنے کے بعد سے کاروباری لوگ کچھ پریشان ہو گئے ہیں لیکن تم اتنے بڑے کاروباری ہو کہ تمہارے لیے پچیس ہزار کی رقم اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس طرح اچھل پڑو۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن...." جمشید خاں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر سوچنے لگا کہ داور کہیں اسے بلیک میل تو نہیں کرنا چاہتا؟
"لیکن کیا؟" داور نے پوچھا۔
"خیر چھوڑو۔" جمشید خاں پھیکے سے انداز میں مسکرایا "میرا دھیان اپنی کاروباری پریشانیوں کی طرف چلا گیا تھا لیکن تم سے وہ سب کچھ کہنے سے کیا حاصل۔ اگر تم پریشان ہو تو مجھے ایک دوست کی حیثیت سے تمہاری مدد تو کرنا ہی چاہیے۔"
جمشید خاں نے اسے چیک دینا مناسب نہیں سمجھا اور نقد پچیس ہزار دے دیے۔ داور شکریہ ادا کرکے رقم لے گیا۔ جمشید خاں سوچتا رہا کہ اگر داور نے مستقل طور پر اس کا پیچھا لیا تو پھر یہ بات یقینی ہو جائے گی کہ وہ اسے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔
ایک خلش سی اس کے ذہن میں رہی جو ایک ماہ گزر جانے کے بعد بتدریج کم ہونے لگی لیکن دوسرا مہینہ گزرتے ہی داور پھر اس کے دفتر میں موجود تھا۔
"میں بہت پریشان ہو گیا ہوں جمشید۔" اس نے کہا "ان پچیس ہزار روپوں سے بھی کام نہیں چل سکا۔ مجھے مزید رقم کی ضرورت ہے۔"
جمشید خاں کے جسم میں غصے کی لہریں دوڑنے لگیں لیکن اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "اتنی جلدی جلدی تمہارے لیے کچھ کرنا تو میرے لیے مشکل ہو گا۔"
"میں نہیں سمجھتا کہ یہ تمہارے لیے کوئی مشکل معاملہ ہے۔"
"اپنی پریشانیاں انسان خود ہی سمجھ سکتا ہے۔"
"دیکھو جمشید!" داور نے کچھ تلخ لہجے میں کہا "میں نے تو تمہاری خاطر بہت خطرناک کام کیے ہیں۔"
"میں تمہیں ان کا بھرپور معاوضہ بھی دیتا رہا ہوں۔"
"وہ کام اتنے خطرناک تھے کہ اس کا معاوضہ ان سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے تھا۔"
"تو تم وہ باقی معاوضہ لینا چاہتے ہو؟" جمشید خاں کے لہجے میں بھی تلخی آ گئی۔
"یہی سمجھ لو۔"
"صاف لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔"
"چلو میں اعتراف کر لیتا ہوں کہ حقیقت یہی ہے۔" داور مسکرا پڑا "اگر تم پہلی ہی ملاقات میں یہ بات کہہ دیتے تو بھی میں اعتراف کر لیتا۔ میں نے بہرحال تمہارے لیے بہت خطرناک کام سر انجام دیے ہیں جن کی وجہ سے مجھے کسی قدر خوش حال زندگی گزارنے کا حق ہے۔ تم تو ایک شان دار زندگی گزار رہے ہو۔ مجھے بیس پچیس ہزار جیسی رقومات دینا تمہارے لیے معمولی بات ہے۔"
"اگر میں نہ دوں تو تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟" جمشید خاں نے نفرت سے کہا۔
"بابرہ طلعت آج بھی زندہ ہے۔" داور نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اور وہ تمہاری تلاش میں ہے۔"
جمشید خاں چونک پڑا تھا۔
"میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔" داور مسکرایا "لیکن جب سے اب تک میں یہ کوشش ضرور کرتا رہا ہوں کہ وہ تم تک نہ پہنچ سکے۔"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" جمشید خاں نے جھٹکے سے کہا لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ داور کی بات صحیح بھی ہو سکتی ہے۔
"اگر تم چاہو تو اس کے درشن کرکے میری بات کی تصدیق کر سکتے ہو لیکن وہ اس شہر میں نہیں ہے۔ وہ اس شہر میں ہے جہاں کے پتے کا جعلی شناختی کارڈ بنوا کر تم نے اس سے نکاح کیا تھا۔ نکاح نامے میں درج وہ پتا اس نے یاد رکھا تھا لہٰذا اس نے سب سے پہلے اسی شہر کا رخ کیا تھا۔ میں نے بھی اسے تمہارے اصل پتے سے بے خبر رکھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ تم یہی چاہو گے۔ بالفرض اگر تم یہ نہیں چاہتے ہو تو میں اسے تمہارا پتا بتائے دیتا ہوں۔"
"تو تم نے اسے اس لیے زندہ رہنے دیا کہ مجھے بلیک میل کر سکو؟"
"نہیں۔" داور نے کہا "پہلے تو میرا منصوبہ کچھ اور تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ میں تم سے اس کی زندگی کا خراج وصول کرتا رہوں۔"
"اسے میرا پتا معلوم ہو گیا تو بھی وہ کیا کر لے گی؟"
"وہ تمہارے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرا دے گی اور وہ حالات بتا دے گی جو اس کے اپنے شہر میں اس پر گزرے تھے۔ پولیس کو اس نکاح خواں کے گھر میں لگنے والی آگ کی تصدیق بھی حاصل ہو جائے گی۔ بابرہ طلعت کے بیان سے وہ اس مکان تک بھی پہنچ جائے گی جو تمہارے کہنے سے میں نے کرائے پر حاصل کیا تھا اور جہاں تم نے بابرہ کو رکھا تھا۔"
"کیا اس طرح تم نہیں پھنسو گے؟" جمشید خاں اسے گھورتا رہا۔

"نہیں۔" داور نے جواب دیا "میرا بیان یہ ہوگا کہ تم میرے دوست تھے اس لیے میں نے اپنے اس گھر کے تالے کی ایک چابی تمہیں بھی دے رکھی تھی پھر جب ایک دن میں وہاں پہنچا تو وہاں بابرہ طلعت کو بھی دیکھا اور تم نے مجھے بتایا کہ تم اس لڑکی سے اور وہ لڑکی تم سے محبت کرتی ہے مگر اس کے والدین اس کی شادی تم سے نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے یہ بھی کہا کہ میں اس سے تمہارا نکاح کروادوں اور وہ کیونکہ بالغ تھی اس لیے میں نے تم دونوں کا نکاح کروا دیا لیکن جب تم اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تو مجھے تمہاری بدنیتی کا علم ہوا اور بابرہ طلعت کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے باعث میں اسے لے کر تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔" داور مسکرایا "میرے اب تک کے رویے کے باعث بابرہ طلعت نے یہی سمجھا ہے کہ میں بعد میں اس کا ہمدرد بن گیا تھا لہٰذا وہ پولیس میں اسی طرح رپورٹ درج کرائے گی کہ میرے اس بیان کی تردید نہ ہو۔"

جمشید خاں کچھ سوچتا رہا، پھر بولا "مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ بابرہ طلعت زندہ ہے۔"

"میں کہہ تو چکا ہوں کہ تم اس کے درشن کرکے اپنا اطمینان کرلو۔ میں تمہیں اس کا پتا دے سکتا ہوں مگر لکھ کر نہیں۔ میں اپنی تحریر تمہیں نہیں دوں گا۔ میں پتا بتاتا ہوں، تم خود لکھ لو۔"

"بولو۔" جمشید خاں نے ہونٹ بھینچ کر قلم سنبھال لیا۔

داور نے اسے اپنے دوست اشتیاق کا پتا لکھوا دیا، پھر بولا "ایک بینک کی برانچ کا پتا اور میرا اکاؤنٹ نمبر بھی لکھ لو۔ میں اب تم سے بار بار ملنا مناسب نہیں سمجھوں گا۔ جب تم بابرہ طلعت کی زندگی کی تصدیق کرلو تو میرے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار روپے جمع کروا دینا اور ہر دو ماہ کے بعد جمع کراتے رہنا۔ جب بھی تم ایسا نہیں کرو گے، میں بابرہ طلعت کو تمہارے گلے کا پھندا بنادوں گا۔ کیونکہ میں اب تم سے بار بار نہیں ملنا چاہتا اس لیے اسی وقت ایک اور بات بھی طے کرکے جاؤں گا۔ وقت کے ساتھ مہنگائی میں اضافہ ہورہا ہے لہٰذا ہر سال تمہیں اس رقم میں کچھ اضافہ کرنا پڑے گا۔ میں اس سلسلے میں تمہیں ٹیلی فون کردیا کروں گا۔ مجھے تمہارے گھر اور دفتر کے ٹیلی فون نمبر معلوم ہی ہیں۔"

داور کے پُراعتماد لہجے کی وجہ سے جمشید خاں کو بابرہ طلعت کی زندگی کا یقین ہوگیا اور اسے سوچنا پڑا کہ اگر اسے اپنی بیوی قدسیہ کے باپ کی دولت اور جائداد کا وارث بننا ہے تو اسے داور کے ہاتھوں بلیک میل ہونا ہی پڑے گا، تاہم اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ بابرہ طلعت کو ایک مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

"میں کل شام کو ہی اس پتے پر پہنچ جاؤں گا۔" اس نے کہا "لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ میں اس گھر میں گھس کر بابرہ طلعت کو دیکھوں۔"

"میں شام کو ٹھیک چھ بجے بابرہ طلعت کے ساتھ اس گھر سے نکلوں گا۔ اگر تم اس وقت وہاں آس پاس کہیں موجود رہو تو اسے دیکھ ہی لوگے۔" داور نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب مزید کسی گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

○☆○

بابرہ طلعت نے بالکل صحیح سوچا تھا کہ داور جو کچھ چاہتا تھا، اس کی تکمیل ہوچکی تھی اور اسی کے لیے داور اس کا ساتھ دیتا رہا تھا۔

"کال گرل" بننا بابرہ طلعت نے اپنا مقدر سمجھ لیا۔ گندگی میں ایک بار لتھڑ جانے کے بعد اس کے لیے بالکل غیر اہم ہوگیا کہ اپنی باقی زندگی پاکیزگی سے گزارے۔ اس کانٹے کی چبھن اس کے دل سے اب بھی ختم نہیں ہوتی کہ وہ پاکیزہ نہیں رہی تھی لہٰذا اب کال گرل بن کر ہی وہ جمشید خاں کو تلاش کرنے کی مہم اپنے لیے آسان بنا سکتی تھی۔ شہروں شہروں گھومنے کے لیے ملازمت حاصل کرتے رہنا ممکن بھی نہیں تھا۔

داور کے بارے میں بابرہ طلعت کی یہ سوچ درست سہی لیکن ابتدا میں داور کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ بابرہ طلعت کو کسی بڑے شہر میں لے جاکر "لڑکیوں کا کاروبار" کرنے والی کسی بری عورت سے رابطہ کرکے بابرہ طلعت کو اس کے ہاتھ فروخت کردینا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ بابرہ طلعت کو "دوشیزہ" کی حیثیت سے فروخت کرکے اسے خاصی بڑی رقم مل سکتی تھی لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بابرہ طلعت ماں بننے والی تھی تو اسے اپنا منصوبہ بے جان محسوس ہونے لگا۔ اسے ایک ایسی لڑکی کی زیادہ قیمت نہیں مل سکتی تھی جو ماں بننے والی ہو۔

داور کو مایوسی تو ہوئی تھی لیکن پھر فوراً ہی اسے ایک دوسرا منصوبہ سوجھ گیا تھا۔ بابرہ طلعت کی زندگی جمشید خاں کے لیے پریشان کن ہوسکتی تھی لہٰذا اسے بلیک میل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی داور کے ذہن میں یہ بات بھی آئی تھی کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ بابرہ طلعت کو کال گرل بنادے۔ اس طرح اس کی آمدنی کے دو ذریعے ہوجاتے۔ ایک جمشید خاں اور دوسری طرف بابرہ طلعت!

پھر جب بچے کی پیدائش کا وقت قریب آیا تھا تو اس کے ذہن میں ایک اور شیطانی منصوبے نے بھی جنم لے لیا تھا۔ بابرہ طلعت کے بچے کو غائب کرکے وہ کسی مناسب وقت پر اسے بھی اپنے کسی بڑے فائدے کے لیے کام میں لا سکتا تھا۔

اس نے وقت آنے پر ایسا ہی کیا۔ بابرہ طلعت اذیت سے بے ہوش ہوگئی تھی لہٰذا داور کو اپنا کام کرگزرنے کا موقع آسانی سے مل گیا تھا۔ دوسری طرف اس نے پہلے ہی سے ایک مالدار عیاش شخص کو بابرہ طلعت کی تصویر دکھا کر اس کا سودا کرلیا تھا۔

اسی کے گھر میں ایک ایسا کمرا بنایا گیا تھا جیسے وہ کسی میٹرنٹی ہوم کا کمرا ہو۔ اس مالدار شخص نے مردہ ضمیر رکھنے والی ایک لیڈی ڈاکٹر کی خدمات پہلے ہی سے حاصل کررکھی تھیں۔ اپنے کیے

دھرے کے نتیجے میں وہ کئی لڑکیوں کو ماں بننے سے بچانے کے لیے اسی لیڈی ڈاکٹر سے کام لے چکا تھا۔ اس لیڈی ڈاکٹر نے بابرہ طلعت کو کئی گھنٹے تک بے ہوش رکھا تھا اور پھر جب وہ ہوش میں آئی تھی تو اسے بتایا گیا تھا کہ اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔

اسے ڈیڑھ ماہ تک اس جعلی میٹرنٹی ہوم میں رکھا گیا تھا اور پھر اسی لیڈی ڈاکٹر نے بابرہ طلعت کو ایک ایسا انجکشن دیا تھا جس میں نہایت سریع الاثر اور بہت ہی گہرا نشہ آور محلول بھرا ہوا تھا۔

اس نشے نے بابرہ طلعت کی زندگی برباد کردی۔

اس کے کچھ دن بعد داور جمشید خاں سے ملا۔ پہلے بھی وہ ایک ملاقات کرکے جمشید خاں سے پچیس ہزار روپے حاصل کرچکا تھا۔ دوسری ملاقات میں وہ جمشید خان کے سامنے کھل کر ایک بلیک میلر بن گیا۔

پھر درمیان میں ایک دن چھوڑ کر داور بابرہ طلعت کو اپنے ساتھ لے کر اشتیاق کے گھر سے نکلا تھا۔ وہ خود تو اس وقت جمشید خاں کو نہیں دیکھ سکا تھا لیکن جمشید خاں نے یقیناً اس کے ساتھ بابرہ طلعت کو بھی دیکھ لیا تھا کیونکہ اس کے ایک دن بعد ہی داور کے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار روپے جمع ہوگئے۔

پھر دوسرے ہی دن اس نے اشتیاق کا گھر چھوڑ دیا۔ کرائے کے ایک مکان کا بندوبست کرکے وہ اسے مناسب حد تک ڈیکوریٹ بھی کرواچکا تھا۔ اپنی رہائش داور نے اس خوف سے بدلی تھی کہ جمشید خاں زیادہ عرصے تک بلیک میل ہوتے رہنے سے زیادہ بہتر یہ نہ سمجھ لے کہ ایک ہی مرتبہ کوئی بڑی رقم خرچ کرکے اسے اور بابرہ کو ختم کروادے!

داور ایک مجرمانہ ذہن ضرور رکھتا تھا لیکن بنیادی طور پر جرائم پیشہ نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑا بہت خوف زدہ بھی رہتا تھا۔ اسی لیے اس نے جمشید خاں سے یک مشت کوئی بڑی رقم وصول کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مرغی کو حلال کرنے کا خطرہ مول لینے سے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس مرغی کے انڈے کھاتا رہے۔

اس طرح داور کی آمدنی کے دو مستقل ذریعے ہوگئے۔ وہ بابرہ طلعت کا باقاعدہ دلال بن گیا۔ وہ خوب صورت تو تھی ہی، داور نے اسے مزید پُرکشش بنانے کے لیے اسے قیمتی کپڑے اور زیورات بھی لادیے۔

دو ماہ بعد بابرہ طلعت نے فیصلہ کیا کہ جمشید خاں کی تلاش کے سلسلے میں اب کسی دوسرے شہر کا رخ کیا جائے۔ داور اس کے لیے فوراً تیار ہوگیا۔ وہ ایک پل کے لیے بھی بابرہ طلعت کے ذہن میں یہ خیال نہیں آنے دینا چاہتا تھا کہ وہ جمشید خاں کی تلاش میں سنجیدہ نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ بابرہ طلعت خود تو کبھی بھی جمشید خاں کو تلاش نہیں کرسکے گی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ جمشید خاں ملک کے کسی بڑے شہر میں رہتا ہوگا لیکن درحقیقت جمشید خاں کی رہائش نسبتاً ایک چھوٹے شہر میں تھی جس کا نام بھی کبھی بابرہ طلعت کی زبان پر نہیں آتا تھا۔

دوسرے شہر میں کرائے کا ایک مکان لے کر ان دونوں نے ساڑھے تین سال گزارے۔ اتنے عرصے میں بابرہ طلعت نہایت بے باک قسم کی کال گرل بن گئی لیکن تنہائی میں وہ اکثر رویا کرتی تھی۔ اسے اپنے گھر والے بہت شدت سے یاد آتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ ان میں سے کون زندہ تھا اور کون مرچکا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمشید خاں کے لیے اس کی نفرت بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تھی۔

دوسری طرف داور کے بینک بیلنس میں اضافہ ہوتا رہا۔ آمدنی کا ایک ذریعہ بابرہ طلعت تو تھی ہی، دوسری طرف جمشید خاں بھی اس کے اکاؤنٹ میں روپے جمع کرواتا رہتا تھا۔ داور جس شہر میں تھا، وہاں بھی اس نے ایک اکاؤنٹ کھول لیا تھا اور جمشید خاں کے جمع کردہ روپے وہ اسی اکاؤنٹ میں منگوالیا کرتا تھا۔ تین سال میں اس نے جمشید خاں کی قسط بھی پچیس سے بڑھوا کر پینتیس ہزار کروالی تھی۔

ساڑھے تین سال بعد جب بابرہ طلعت اس شہر سے مایوس ہوئی تو وہاں سے ایک اور شہر کا رخ کیا گیا۔

داور کے پاس اب ایک کار بھی تھی۔ ایک کار اس نے بابرہ طلعت کو دلوادی تھی۔ اتنے عرصے میں اسے یقین ہوگیا تھا کہ بابرہ طلعت اب اسے چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اسے بہرحال ایک سہارے کی ضرورت تھی اور داور ایک "شوہر" کی حیثیت سے اس کا سہارا بنا ہوا تھا۔

اتنے عرصے تک جمشید خاں کو بلیک میل کرتے رہنے کے بعد داور کی فطری خوف زدگی بھی اب ختم ہوچکی تھی۔ وہ جمشید خاں سے ہر سال قسط کی رقم بھی بڑھواتا رہا تھا۔ بینک بیلنس میں اضافے کے ساتھ اس کی ہوس بھی بڑھتی چلی گئی تھی لہٰذا ساڑھے تین سال بعد اس نے وہ "چیک" بھی کیش کروانے کا فیصلہ کیا جو اسے بابرہ طلعت کے ماں بننے پر ملا تھا۔

○☆○

داور نے ساڑھے تین سال بعد جمشید خاں سے ملاقات کی اور اپنا "چیک" ایک رنگین تصویر کی صورت میں اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ..... یہ کون ہے؟" جمشید خاں کے منہ سے نکلا۔

"تصویر کو غور سے دیکھو جمشید! شاید میرے کچھ کہے بغیر ہی بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔" داور نے کہا۔

جمشید خاں نے غور سے تصویر کی طرف دیکھا اور پھر چند لمحے بعد ہی اس کا چہرہ متغیر ہوا۔

"ہاں جمشید خاں!" دلاور بولا "یہ تمہاری اولاد ہے۔ ابھی اس کی عمر ساڑھے تین سال سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن اس کے

نقش و نگار حیرت انگیز حد تک بابرہ طلعت سے ملتے ہیں کچھ جھلک تمہارے نقش و نگار کی بھی ہے' اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ آخر یہ تم ہی دونوں کی اولاد ہے۔"

"بکواس کر رہے ہو تم!" جمشید خاں کی آواز کچھ کانپ گئی تھی۔

"یہ تصویر دیکھ کر بھی اگر تم اسے بکواس سمجھتے ہو تو چھوڑو" داور نے بے پروائی سے کہا اور تصویر جمشید خاں کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لی "میرا خیال تو یہ تھا کہ بابرہ طلعت سے تم لاتعلق رہے لیکن اپنی اولاد کی تصویر دیکھ کر تو تمہارا خون ضرور جوش مارے گا۔ تم ضرور اپنی اولاد کو حاصل کرنا چاہو گے لیکن جب تمہیں میری باتیں بکواس محسوس ہو رہی ہیں تو میں اب چلتا ہوں۔ میری اقساط تو مجھے مل ہی رہی ہیں لیکن میرا خیال تھا کہ تم اپنی اولاد کو حاصل کرنے کے لیے ضرور بے قرار ہو جاؤ گے اور مجھے اس کے عوض تم سے ایک معقول رقم مل جائے گی" داور کھڑا ہو گیا۔ وہ جمشید سے اس کے دفتر جا کے ملا تھا۔

"ٹھہرو!" جمشید خاں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

داور مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ میری اولاد ہے؟" جمشید خاں بولا۔

"کیا یہ تصویر بجائے خود ایک ثبوت نہیں؟ اس میں اگر صرف بابرہ طلعت کی شباہت ہوتی تو تم کچھ اور بھی سوچ سکتے تھے لیکن اس میں تمہاری شباہت آخر کیسے آسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب تم نے بابرہ طلعت کو چھوڑا تھا تو وہ ماں بننے والی تھی۔"

"وہ تصویر مجھے پھر دکھاؤ" جمشید خاں کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"دس بار دیکھو۔ یہ تو میں لایا ہی تمہیں دکھانے کے لیے تھا" داور نے جیب سے تصویر نکال کر پھر جمشید کو دے دی۔

چند لمحے جمشید خاں کی نظریں تصویر پر جمی رہیں پھر اس نے داور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ کہاں ہے؟"

"کم از کم بابرہ طلعت کے پاس نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ تمہاری اس اولاد کو جنم دیتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھی لہٰذا مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔ جب بابرہ طلعت ہوش میں آئی تھی تو اسے بتایا گیا تھا کہ اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ رو دھو کر صبر کر لے گی اور میری یہ توقع پوری بھی ہوئی۔ تمہاری اس اولاد کے سلسلے میں' میں نے فوری طور پر تو کچھ اور ہی منصوبہ بنایا تھا لیکن اچانک مجھے دو لاکھ روپوں کی ضرورت پیش آئی تو میں نے سوچا کہ تم سے تمہاری اولاد کا سودا کر لیا جائے۔"

"دو لاکھ" جمشید خاں نے بڑی سختی سے دانت پر دانت جماتے ہوئے تھے۔

"یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں ہے... جمشید خاں جس کے عوض تمہیں تمہاری اولاد مل سکتی ہے اور پھر اس میں تمہارے لیے کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے۔ بابرہ طلعت کو اس کا علم کبھی نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو آج تک یہی سمجھے ہوئے ہے کہ اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔"

"تو پھر یہ کہاں ہے؟" جمشید خاں نے تصویر کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اسی وقت بتایا جا سکتا ہے جب تم مجھے دو لاکھ روپے دے دو۔"

"دو لاکھ روپے لے کر تم غائب ہو گئے تو میں تمہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟"

"تمہیں مجھ پر اعتبار تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم قابلِ اعتبار ہو تو نہیں" جمشید خاں نے تلخی سے کہا۔

"تو ہم بات چیت یہیں پر ختم کیے دیتے ہیں" داور نے بے پروائی سے کہہ کر تصویر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

تصویر جمشید خاں کے سامنے میز پر تھی۔ اس نے مضطربانہ انداز میں تصویر پر ہاتھ رکھ کر داور کو تصویر اٹھانے سے روک دیا۔

"خوب!" داور عیارانہ انداز میں مسکرایا "تصویر دیکھ کر خون جوش مارنے لگا نا؟ یا پھر اگر تمہیں اب بھی خدشہ ہے کہ شاید یہ تمہاری اولاد نہ ہو تو بھی تم نے غالباً یہ سوچا ہو گا کہ دو لاکھ روپے تمہارے لیے کوئی بڑی رقم نہیں۔ ویسے بھی اب تم میری قسط پینتیس ہزار کر چکے ہو۔ تم یہ سوچ سکتے ہو کہ تم نے مجھے چھ قسطوں کی ادائیگی یک مشت کر دی' اور اگر یہ واقعی تمہاری اولاد ہے تو یہ سودا تمہارے لیے بہت سستا ہو گا۔"

"تم رقم کب چاہتے ہو؟"

"اگر تم اس وقت ادائیگی کر سکو تو اچھا ہے ورنہ میں کل تک بھی انتظار کر سکتا ہوں۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد تمہیں اپنی اولاد کو گلے لگانے کے لیے چوبیس گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔"

"کیوں؟" جمشید خاں نے اسے گھورا۔

"یہ میں اسی وقت بتاؤں گا جب مجھے روپے مل جائیں گے۔ یہ میری ایک مجبوری ہے کہ میں تمہیں قبل از وقت نہیں بتا سکتا۔ میں تم سے اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں تمہیں دھوکا دوں تو تم میری چھ اقساط روک لینا۔"

"ہوں" جمشید خاں نے گھڑی دیکھی "میں تمہیں ابھی ادائیگی کر دیتا ہوں۔"

"گڈ!" داور نے سر ہلایا۔

○☆○

بنگلے کے اسٹور میں کرسی سے بندھا ہوا جمشید خاں ایذا رسانی

کے آلات کی طرف دیکھتے ہوئے ماضی کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور اسی بنگلے کے ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں نیلی آنکھوں والا نوجوان سگریٹ پیتا ہوا چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ چونک گیا۔ اس وقت کون آسکتا ہے؟ اس نے چائے کی پیالی چھوڑی اور تیزی سے دروازے کے قریب پہنچا "کون؟"

باہر سے ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔

نوجوان نے دروازہ کھولا "کیا بات ہے؟"

ملازم نے بتایا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنا چاہتی ہے۔

"لڑکی!" نوجوان پھر چونکا "کہاں ہے؟"

ملازم نے بتایا کہ وہ کار پر آئی ہے لیکن چوکیدار اجازت لیے بغیر پھاٹک نہیں کھولنا چاہتا۔

ملازم نے بتایا "وہ اپنا نام سمیرا بتا رہی ہیں۔"

"اوہ!" نوجوان مضطرب ہوگیا اور پھر جلدی سے بولا "فوراً پھاٹک کھلواؤ' آنے دو کار کو۔"

ملازم تیزی سے پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ نوجوان نے چند لمحے بعد پھاٹک کھلتے ہوئے دیکھا۔ پھر سمیرا کی کار بھی اندر آگئی۔

سمیرا کار روک کر برآمدے میں آئی تو نوجوان اسے جلدی سے اندر لے گیا اور بولا "تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا سمیرا!"

"تمہارا فون نہیں آیا تو میں پریشان ہوگئی تھی۔"

"میں تمہیں فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پولیس اس قسم کے معاملات میں ہر ایک پر شک کرتی ہے۔ ان حالات میں ممکن ہے کہ تم بھی پولیس کی نظر میں مشکوک ہو اور انہوں نے تمہارے گھر کے سب ٹیلی فون آبزرویشن میں رکھ لیے ہوں۔"

"میں یہ جاننے کے لیے بہت بے چین تھی کہ ڈیڈی اعتراف کرنے پر تیار ہوئے یا نہیں۔"

"ابھی تو نہیں ہوئے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ ہو جائیں گے۔"

"اب تک کیا ہوا ہے؟" سمیرا نے بے چینی سے پوچھا۔

نوجوان' سمیرا کے آنے سے بہت مضطرب ہوگیا تھا لیکن اب تو وہ آہی چکی تھی للہٰذا اس نے مختصر طور پر سب کچھ بتا دیا۔

"اوہ گاڈ!" سمیرا کے منہ سے نکلا۔ "وہ رات سے اب تک بندھے ہوئے ہیں۔"

"اعتراف کروانا ہے تو ان پر تھوڑا بہت دباؤ تو ڈالنا ہی پڑے گا۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ خوفناک فلمیں ان کی بہت بڑی کمزوری ہیں۔"

"وہ میں انہیں دکھا چکا ہوں۔ اسے دیکھ کر ان کے پسینے تو چھوٹ گئے مگر انہوں نے زبان نہیں کھولی۔ میں نے ابھی تمہیں سب کچھ بتا تو دیا ہے۔ اب میں انہیں آدھے گھنٹے کا وقت دے کر ایذا رسانی کا سامان ان کے سامنے چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ان آلات کو دیکھتے دیکھتے ان کے اعصاب ضرور جواب دے جائیں گے۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟"

"تمہارے مشورے ہی سے میں نے سب کچھ کیا ہے سمیرا! تم اب اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"تم ان پر اذیت رسانی کے آلات کا استعمال تو نہیں کرو گے نا؟" سمیرا کی آواز کسی حد تک رندھی ہوئی تھی۔

"نہیں بھئی!" نوجوان نے تھوڑا سا جھنجلا کر کہا "یہ بات تو ہم میں پہلے ہی طے ہوگئی تھی کہ انہیں اذیت نہیں دی جائے گی۔"

"مجھے ڈر لگا ہوا تھا کہ تم کہیں تنگ آکر..."

"فضول خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دو' اور بس اب یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں رکنا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ اگر ایذا رسانی کے آلات بھی ان کے اعصاب نہ توڑ سکے تو بھی رات تک میں ان سے اعتراف کرا ہی لوں گا۔"

"کس طرح؟"

"پلیز سمیرا! جب تم نے مجھ پر اعتماد کیا ہے تو سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو اور گھر جاؤ۔"

"پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ ڈیڈی جلد ہی سب کچھ بتا دیں گے لیکن اتنا وقت گزر جانے کی وجہ سے گھر میں بھی بات کھل چکی ہے۔ سائرہ کو بھی میں ٹیلی فون پر حقیقت بتانے کے لیے مجبور ہو چکی ہوں۔ وہ اتنی پریشان ہوگئی ہے کہ کسی بھی فلائٹ سے واپس آجائے گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ..."

"تم مجھے کچھ نہ بتاؤ۔ پلیز! جلد از جلد یہاں سے چلی جاؤ۔ تم زیادہ دیر رکو گی تو ملازمین بھی نہ جانے کیا سوچیں گے۔"

سمیرا نہ جانے کیا بتانا چاہتی تھی لیکن نوجوان نے کچھ نہیں سنا اور اسے زبردستی روانہ کر دیا۔

جب اس کی کار پھاٹک سے نکل گئی تو نوجوان نے اطمینان کی سانس لی اور ڈرائنگ روم میں آکر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور اسٹور روم کی طرف بڑھا۔

جمشید خاں نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر دوسری طرف سر گھمایا۔

"شاید تمہاری اکڑ اب تک ختم نہیں ہوئی ہے جمشید خاں!" نوجوان بولا "کیا میں ایذا رسانی کے ان آلات کا استعمال شروع کروں؟"

"جو دل چاہے کرو۔ میں کسی بے بنیاد بات کا اعتراف نہیں کر سکتا۔"

"ہوں" نوجوان نے ہونٹ بھینچ کر اسے گھورا "اعتراف تو میں تم سے کرا لیتا جمشید خاں لیکن کسی کی خواہش ہے کہ میں یہ

آلات تم پر استعمال نہ کروں۔ اب میرے لیے صرف یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ میں تمہیں کرسی سے بندھا رہنے دوں۔ ویسے تو میرا خیال ہے کہ بندھے بندھے اب تک تمہاری حالت بہت بری ہو چکی ہو گی جس کا تم اظہار نہیں کر رہے ہو لیکن اگر تم رات تک بندھے رہے تو مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک تمہاری جو حالت ہو گی' وہ تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ پھر شاید تم اعتراف کرنے پر مجبور ہو ہی جاؤ۔"

جمشید خاں کچھ نہیں بولا۔

نوجوان چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

○☆○

رات کے ساڑھے نو بجے تھے جب انٹیلی جنس آفیسر صمدیار خاں سمیرا سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ اس وقت اس کی آمد سمیرا کے لیے اتنی اچانک تھی کہ وہ کچھ بے چین ہو گئی۔

"اب آپ کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"جب آپ گئے تھے' اس کے گھنٹے بھر بعد ان کی حالت سنبھل گئی تھی۔"

"آپ اس پتے سے تو واقف ہوں گی" صمدیار خان نے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اس پتے پر نظر پڑتے ہی سمیرا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

صمدیار خاں بولا "یہ گھر سردار علی صاحب کا ہے جو ایک بہت بڑے سرکاری منصب پر فائز ہیں۔ ان کا ایک جوان بیٹا اور ایک جوان بیٹی ہے۔ سال بھر قبل بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یورپ میں رہتی ہے۔ میری تحقیق کے مطابق کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب تھی اس لیے سردار علی صاحب پندرہ دن کی چھٹی لے کر اپنی بیوی کے ساتھ اپنی بیٹی کو دیکھنے چلے گئے ہیں۔ ان کا جوان لڑکا ایاز یہیں ہے۔ آج شاید آپ اس سے ملنے اس کے گھر گئی تھیں' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جی نہیں" سمیرا کی آواز بھرائی ہوئی تھی "ایاز میرا کالج کا دوست ہے۔"

"کیا جمشید خاں صاحب کے اغوا کے سلسلے میں وہ بھی آپ کے ساتھ ہے؟"

سمیرا نے سنبھلنے کی کوشش کی اور تیزی سے کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آپ مجھے سختی پر مجبور نہ کریں تو بہتر ہوگا" صمدیار خاں نے سرد لہجے میں کہا "اگر وہ آپ کے والد نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ انہوں نے آپ کی پرورش تو کی ہے' وہ آپ سے محبت تو کرتے ہیں۔ آپ اس وقت غالباً پونے چار سال کی تھیں جب انہوں نے آپ کو ایک یتیم خانے سے لیا تھا۔ وہ غالباً مایوس ہو گئے تھے کہ ان کی بیوی ماں نہیں بن سکے گی اس لیے انہوں نے کسی کے بچے کو لے کر اس کی پرورش کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ آپ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ ایک بہت آسودہ حال گھرانے کی لے پالک بنیں ورنہ اس یتیم خانے میں رہ کر آپ کیا بنتیں؟ کم از کم وہ نہیں بنتیں جو آپ آج ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے انہیں اغوا کروایا۔ آخر کیوں؟ کیا چاہتی ہیں آپ ان سے؟"

سمیرا اتنی نروس ہو گئی تھی کہ اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔

صمدیار خاں چند لمحے اس کی حالت کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا "آپ پر شبہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب آج میرے سامنے ہی مسز جمشید آپ کو ڈانٹ رہی تھیں۔ سمیرا بی بی' میں جس محکمے میں کام کر رہا ہوں وہاں میں نے تیس سال گزارے ہیں۔ ایک ماہ کے اندر اندر تو میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔ اسی تیس سالہ تجربے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ کو ڈانٹتے وقت ان کی آنکھوں میں جو کیفیت تھی وہ کسی ماں کی آنکھوں میں اپنی بیٹی کو ڈانٹتے وقت نہیں ہو سکتی۔ اسی سے میرا ذہن کھٹکا تو میں نے جمشید خاں صاحب کے دو ایک ملنے والوں سے ملاقات کی اور انہی سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ ان کی سگی بیٹی نہیں ہیں بلکہ لے پالک ہیں۔ وہ آپ کو ایک دوسرے شہر کے یتیم خانے سے لائے تھے۔ اس کے بعد میں نے آپ کی نگرانی کی تو یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ آپ ایاز سے ملنے گئی تھیں۔ میں نے ایاز اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی چھان بین کر ڈالی۔ میرے پاس کوئی ثبوت تو نہیں تھا لیکن میرا یہ شبہ بڑھتا رہا کہ آپ ہی نے کسی وجہ سے جمشید خاں کو اغوا کروایا ہے۔ ابھی ایک گھنٹے پہلے میں نے ایک تجربہ بھی کیا۔ آپ کل رات بے ہوشی کی حالت میں جس جگہ پولیس کو ملی تھیں' میں اس جگہ گیا تھا۔ آدھی رات کے بعد تو وہاں تاریکی شاید اور بڑھ جاتی ہو لیکن اس وقت بھی وہاں اتنی تاریکی تھی کہ مجھے آپ کا بیان بالکل غلط معلوم ہونے لگا۔ آپ نے بتایا تھا کہ جب آپ کی ناک اور منہ پر کلوروفارم کا رومال رکھا گیا تھا' اس سے صرف دو تین لمحے پہلے آپ کی نظر چار آدمیوں پر پڑی تھی مگر کیونکہ وہ نقابیں لگائے ہوئے تھے اس لیے آپ ان کے چہرے نہیں دیکھ سکیں۔ سمیرا بی بی! وہاں تو اس وقت بھی اتنی تاریکی تھی کہ چند فٹ کے فاصلے پر کوئی شخص موجود ہو تو وہ صرف سائے ہی کی طرح نظر آ سکتا ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اگر وہ نقاب لگائے ہوئے ہو تو اس کی نقاب بھی نظر آ جائے۔"

سمیرا سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔

صمدیار خاں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ نے ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔ اب آپ یہ بات اپنی زبان پر بھی لے آئیں کہ آپ نے اس شخص کو کیوں اور کس ذریعے سے اغوا کروا کے کہاں رکھا ہے جو آپ کا

باپ نہ سہی لیکن اس نے آپ کو باپ جیسی محبت ضرور دی تھی؟"

"ایسا نہیں ہے" سمیرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کیسا نہیں ہے؟"

"میں بظاہر ان کی لے پالک ہی ہوں اور وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مجھے حقیقت کا علم نہیں لیکن مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ وہی میرے والد ہیں۔ بس اتنا ہے کہ وہ میری ماں نہیں ہیں جن سے آپ آج ملے تھے۔"

صمد یار خاں اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

○☆○

سمیرا کو اس حقیقت کا علم صرف دو ماہ قبل ہوا تھا۔

وہ کار میں اپنے کالج سے نکلی تھی تو پھاٹک کے باہر ہی اس کی کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ کار سے اتر کر وہ پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر کسی ایسے آدمی کو دیکھنے لگی تھی جو اس کی کار کا ٹائر بدل سکے۔ اسی وقت اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک عورت کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ عورت بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سمیرا کو ایسا لگا تھا جیسے وہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہو لیکن اپنی کار کی پریشانی کی وجہ سے وہ اس عورت پر زیادہ دھیان نہیں دے سکی۔ کالج کا چوکیدار اس کی پریشانی دیکھ کر اس کے قریب آگیا تھا۔ اسی نے اس کی کار کا ٹائر تبدیل کیا تھا۔ اس پریشانی سے نکلنے کے بعد سمیرا کو پھر اس عورت کا خیال آیا تھا لیکن اسی اثنا میں وہ عورت اپنی کار میں وہاں سے جا چکی تھی۔

سمیرا نے اس کا خیال اپنے ذہن سے جھٹکا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

گھر پہنچ کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب وہ اپنے بال درست کرنے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنا چہرہ دیکھتے دیکھتے یکایک اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اسے وہ عورت یاد آگئی جسے اس نے اپنے کالج کے باہر ایک کار میں دیکھا تھا۔ وہ اسے کچھ شناسا محسوس ہوئی تھی لیکن اپنی کار کی پریشانی کے باعث "شناسائی" کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ وہ سبب اس کی سمجھ میں اس وقت آیا جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ شناسائی کے اس احساس کا سبب یہ تھا کہ وہ اس عورت سے خاصی حد تک مشابہ تھی۔

سمیرا گم صم سی حالت میں قدم اٹھاتی ہوئی اپنے بستر پر جا بیٹھی اور اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا، کہیں وہ میری ماں تو نہیں؟

یہ سوال سمیرا کے دماغ میں اس لیے ابھرا کہ وہ خود کو جمشید خاں کی لے پالک سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جب پونے چار سال کی تھی تو جمشید خاں نے اسے ایک یتیم خانے سے لے کر پالا تھا۔

ایک سال بعد قدسیہ جمشید بھی ایک بیٹی کی ماں بن گئی تھی۔ اس لڑکی کا نام سائرہ رکھا گیا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد سمیرا، قدسیہ جمشید کی توجہ سے محروم ہوگئی۔ سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ قدسیہ جمشید اور جمشید خاں کے درمیان باعثِ نزاع بھی بن گئی ہے۔ قدسیہ جمشید کا خیال تھا کہ اولاد کی خواہش میں جمشید خاں اتنا بے چین ہوا تھا کہ اس نے یتیم خانے کی ایک لڑکی لے کر پال لی تھی جس کے باپ کا کچھ پتا تھا، نہ ماں کا!

اگر سمیرا کو جمشید خاں کی بھرپور توجہ اور محبت حاصل نہ ہوتی تو اس گھر میں ایک سانس لینا بھی اس کے لیے دوبھر ہوجاتا۔ جب سائرہ کچھ بڑی ہوئی تھی تو ماں کی تربیت کے باعث اس کا رویہ بھی سمیرا سے معاندانہ ہوگیا تھا۔ اس ماحول میں سمیرا کبھی کبھی اتنی گھٹن محسوس کرتی تھی کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس گھر سے بھاگ جائے لیکن وہ ایسا کر نہیں سکی۔ اسے اس بات پر تعجب بھی ہوتا تھا کہ آخر وہ جمشید خاں سے اتنی محبت کیوں کرنے لگی ہے کہ ان سے دور ہوجانا اسے ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ اسے جمشید خاں کی بھرپور محبت حاصل تھی؟ اس وقت تک اسے علم نہیں تھا کہ وہ واقعی جمشید خاں کی بیٹی تھی اور غالباً وہ خون کا اثر تھا کہ وہ جمشید خاں کو بہت چاہنے لگی تھی

جمشید خاں سے محبت کے باعث وہ اس گھر سے کہیں نہیں گئی جہاں کے ماحول میں اسے ایک طرف محبت حاصل تھی تو دوسری طرف سے شدید مغائرت کا سامنا بھی تھا۔

کبھی کبھی اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی تھی کہ آخر اس کے ماں باپ کیسے ظالم تھے کہ انہوں نے.... اس کی پیدائش کے فوراً بعد اسے فجر کے وقت ایک مسجد کی سیڑھیوں پر لے جاکر ڈال دیا تھا۔

سمیرا کے شدید اصرار پر جمشید خاں نے اسے یہ بات بتائی تھی کہ جو پہلا نمازی اس مسجد میں آیا تھا، اس نے سمیرا کے رونے کی آواز سننے کے بعد اسے دیکھا تھا۔ پھر اور لوگ بھی جمع ہوگئے تھے اور پولیس کو بھی اس کی اطلاع دے دی گئی تھی۔

پولیس نے اسے فوری طور پر تو ایک یتیم خانے کے حوالے کردیا تھا لیکن یہ تفتیش بھی جاری رکھی تھی کہ ایک نومولود بچی کو مسجد کی سیڑھیوں پر ڈال جانے والا کون ہوسکتا ہے۔ کچھ دن تک کی چھان بین کے بعد پولیس نے مایوس ہوکر اس کیس کی فائل بند کردی تھی۔

یہ سب کچھ جاننے کے بعد سمیرا نے بڑی دلگرفتہ آواز میں کہا تھا "کہیں میں کسی کی ناجائز اولاد تو نہیں ہوں ڈیڈی!"

"ہرگز نہیں بیٹی!" جمشید خاں نے اسے اپنے گلے سے لگالیا تھا "تمہیں اس یتیم خانے میں دیکھنے کے بعد اور یہ سارے حالات جاننے کے باوجود میرے دل نے گواہی دی تھی کہ تم کسی کی ناجائز اولاد ہرگز نہیں ہو۔ دراصل آج بھی ہمارے معاشرے میں ایسے

مرد موجود ہیں جن کے لیے بیٹی کی پیدائش ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اور وہ اس سے اپنی جان چھڑا لیتے ہیں۔ بعض حالات میں تو بچی کی ماں کو بھی معلوم نہیں ہوپاتا کہ اس کی بچی کہاں گئی' لیکن بیٹی! یہ سب کچھ میں نے تمہارے اصرار سے مجبور ہو کر بتایا ہے۔ قدسیہ کو میں نے ان باتوں سے بے خبر رکھا ہے۔ اگر اسے معلوم ہوگیا تو وہ اور زیادہ طوفان کھڑا کرنے لگے گی۔ تم بھی اس کا خیال رکھنا۔ آج کے بعد تم خود بھی .... ان باتوں کو ذہن میں نہ لانا۔ جھٹک دینا یہ سب کچھ اپنے ذہن سے۔"

لیکن یہ ایک غیر فطری امر ہوتا کہ سمیرا وہ باتیں فراموش کردیتی۔ وہ سب باتیں اسے اکثر بے چین کردیا کرتی تھیں اور وہ سوچا کرتی تھی کہ اس کے ماں باپ نہ جانے کون ہوں گے اور کہاں ہوں گے؟

انہی الجھنوں میں جب وہ بی اے کے فائنل ایئر میں تھی تو اس روز وہ عورت اسے نظر آئی۔

اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ضرور تھی۔ اس نے اپنے بالوں کا رنگ براؤن کرالیا تھا۔ آنکھیں سیاہی مائل بھوری تھیں لیکن اس عمر میں بھی اس کے نقش و نگار دلکش تھے۔

سمیرا اس کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ جب وہ جوان ہوگی تب تو شاید وہ اس سے بہت زیادہ مشابہ ہو۔

دوسرے دن کالج میں اس کا دھیان پڑھائی میں نہیں رہ سکا۔ یہ سوال اس کے ذہن میں بار بار ابھرتا رہا کہ کیا آج بھی وہ عورت اس کے کالج کے باہر موجود ہوگی؟

جب وہ کار میں اپنے کالج سے نکلی تو اسے اپنے سوال کا جواب اثبات میں مل گیا۔ اس عورت کی کار وہاں موجود تھی اور وہ خود ہی اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

سمیرا کا دل مچل گیا کہ وہ کار روک کر اس عورت کے پاس جائے اور اس سے بات کرے لیکن اس نے بہت عجلت میں ہی فیصلہ کر ڈالا کہ اس عورت سے اس کے گھر جا کر ملنا زیادہ مناسب رہے گا۔

اسی دن سمیرا نے ایاز سے ملاقات کی اور اسے اس عورت کے بارے میں بتایا۔

وہ اور ایاز ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایاز بھی یہی سمجھتا تھا کہ سمیرا' جمشید خاں کی حقیقی اولاد نہیں بلکہ لے پالک ہے لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ سمیرا سے شادی کرنے کا قطعی فیصلہ کرچکا تھا۔

سمیرا کو یقین تھا کہ اگلے دن بھی وہ عورت اس کے کالج کے پھاٹک کے باہر ضرور ہوگی۔ اس نے اس کی کار کا نمبر ذہن نشین کرلیا تھا۔ وہ اس نے ایاز کو بتایا اور اس سے کہا کہ وہ اس عورت کا تعاقب کرکے اس کے گھر کا پتا لگائے۔ ایاز نے اس کا سبب جاننا چاہا تھا لیکن اس وقت سمیرا نے اسے کچھ نہیں بتایا۔

اگلے دن سمیرا نے اس عورت کو پھر دیکھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ عورت اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ سمیرا اس کی طرف زیادہ توجہ دیے بغیر اپنی کار نکالے چلی گئی۔ اسے اطمینان تھا کہ ایاز اس عورت کا تعاقب کرکے اس کا پتا لگا لے گا۔

سمیرا کا خیال درست ثابت ہوا۔ تین گھنٹے بعد ہی ایاز نے اسے فون کرکے اس عورت کا پتا بتایا اور کہا "میں نے یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ وہ وہاں تنہا رہتی ہے اور اس کا نام بابرہ طلعت ہے۔"

"تم نے میرے ذہن کا بہت بڑا بوجھ ہلکا کردیا ایاز۔ میں اس سے آج ہی ملوں گی۔"

"میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا سمیرا۔ تم اس سے بے حد مشابہت رکھتی ہو۔ کہیں وہ...."

"تم ایک دم چپ ہوگئے لیکن میں سمجھ گئی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے تھے۔ وہی خیال میرے ذہن میں بھی ہے ایاز۔ میں آج ہی اس سے ملوں گی اور پھر کل تمہیں تفصیلات سے آگاہ کروں گی۔"

اس وقت چار بج چکے تھے۔ جمشید خاں اس روز اپنے دفتر سے جلدی گھر آگئے تھے۔ سمیرا نے ان سے بہانہ کیا کہ وہ اپنی کسی دوست سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہے' اور پھر اجازت مل جانے کے بعد وہ اپنی کار میں اس عورت کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

پتا بہت آسان تھا۔ سمیرا کو وہاں پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی جس کا نمبر اسے ایاز سے معلوم ہوا تھا۔

○☆○

گھنٹی کی آواز سن کر بابرہ طلعت نے دروازہ کھولا اور سمیرا کو اپنے سامنے دیکھ کر چونکی بھی اور کچھ بوکھلا بھی گئی۔ سمیرا اس کی طرف بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں.... تمہیں.... کس سے ملنا ہے.... بیٹی!" بابرہ طلعت نے رک رک کر کہا اور "بیٹی" کہتے وقت شدید جذباتیت نے اس کی آواز میں لرزش پیدا کردی۔

"میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں۔ اگر آپ مجھے اندر بلالیں تو میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں گی۔" سمیرا نے کہا۔

بابرہ طلعت پریشان بھی تھی کہ سمیرا اس کے گھر کیسے آگئی اور بیٹی کو اپنے قریب پاکر اسے اپنے جذبات پر قابو پانا بھی دشوار معلوم ہو رہا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آؤ۔"

وہ ایک طرف ہٹی تو سمیرا اندر آگئی۔ بابرہ طلعت نے دروازہ بند کیا اور صوفوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی "بیٹھو۔"

لیکن سمیرا نے اصرار کیا کہ پہلے وہ بیٹھے۔

پھر جب دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئیں تو بابرہ طلعت نے کہا

"میں حیران ہوں کہ تم مجھ سے ملنے کیوں آئی ہو؟"

سمیرا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "حیرت کا اظہار تو میں بھی کرسکتی ہوں کہ آخر آپ مجھے دیکھنے کے لیے میرے کالج کیوں آیا کرتی ہیں؟"

"میں...." بابرہ طلعت سٹپٹا گئی "ایسا تو نہیں ہے۔"

"پلیز، مجھ سے جھوٹ نہ بولیے۔" سمیرا نے التجائیہ انداز میں کہا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے "جو شبہ مجھے ہوا ہے' میں اس کی تصدیق چاہنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"کیسا شبہ؟"

"آپ کے چہرے کی کیفیت سے میرے شبے کو تقویت بھی مل رہی ہے' لیکن اسے مکمل یقین میں آپ ہی بدل سکتی ہیں۔"

"تم کس شبے کی بات کررہی ہو؟" بابرہ طلعت کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوچکی تھیں۔

سمیرا نے پوچھا "ہم دونوں میں اتنی زیادہ مشابہت کیوں ہے؟"

"دنیا میں ایسے لوگ اکثر دیکھنے میں آجاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔"

"آپ نے جواب تو دے دیا اور آپ کا جواب صحیح بھی ہے لیکن آپ کے لہجے میں وہ مضبوطی نہیں تھی جو مجھے قائل کرنے کے لیے آپ کے لہجے میں ہونا چاہیے تھی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"کیا میں آپ کے قریب آکر بیٹھ جاؤں؟"

"آجاؤ۔" بابرہ طلعت کی آواز پھر کانپ گئی۔

سمیرا اس کے برابر میں جا بیٹھی اور اچانک بابرہ طلعت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھتی ہوئی بولی "اب میری قسم کھا کر کہیے کہ میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

انتہائی کوشش کے باوجود بابرہ طلعت کو اپنے امنڈتے ہوئے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے "میری بچی! میری بیٹی!" اس نے بے تابی سے سمیرا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ماں!.... میری اچھی ماں!" سمیرا کی آنکھوں سے بھی آنسو امنڈ پڑے لیکن وہ خوشی کے آنسو تھے "آخر آپ مجھے مل ہی گئیں' لیکن ایسا کیوں ہوا کہ آپ نے اپنی بیٹی کو' ایک ننھی سی جان کو خود سے الگ کرنا گوارا کرلیا تھا؟"

بابرہ طلعت نے سمیرا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے جذبات کسی طوفان کی طرح بپھرنے لگے تھے۔ اس نے سمیرا کے گالوں اور پیشانی پر بوسوں کی جیسے بوچھار کردی۔ دونوں ماں بیٹی کے آنسو ایک دوسرے کے چہروں کو بھگو رہے تھے۔

خاصی دیر میں ماں بیٹی کا جذباتی طوفان تھما۔

دس ماہ قبل تک بابرہ طلعت کو سمیرا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ لگ بھگ پچیس سال سے وہ جمشید خاں کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اٹھارہ سال گزرنے کے بعد تو وہ اس حد تک مایوس بھی ہوگئی تھی کہ اس نے آخری سات سال ایک ہی شہر میں گزار دیے تھے۔ داور اس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ تیرہ ماہ قبل اس پر بہت سیریس قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ اس اٹیک سے تو زندہ بچ گیا لیکن اس کی صحت بہت زیادہ گرگئی۔ اس کے بعد وہ بہت زیادہ مایوس بھی رہنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے یقین ہوگیا ہو کہ اب وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہیں بچے گا۔

ان دنوں ان کے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ داور نے چھ سو گز پر ایک خوب صورت سا مکان بھی بنوالیا تھا۔ اس کے بینک میں بھی خاصی معقول رقم موجود تھی۔ بابرہ طلعت کے پاس بھی بہترین ملبوسات' زیورات' کار' سب کچھ تھا لیکن اس کے لیے ان میں سے کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جمشید خاں کی تلاش میں ناکامی سے وہ اتنی مایوس ہوگئی تھی کہ اس کے بعد ایک زندہ لاش کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ داور کے ہارٹ اٹیک یا اس کی خرابی صحت کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ داور سے اسے کبھی کوئی لگاؤ رہا ہی نہیں تھا۔ لگاؤ ہوتا بھی کیسے؟ اس کے دل میں اس کانٹے کی چبھن کبھی ختم نہیں ہوسکی تھی کہ داور نے اسے ایک طوائف کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر مجبور کردیا تھا۔

خرابی صحت کے باعث داور کا زیادہ تر وقت گھر میں ہی گزرتا تھا لیکن ایک دوپہر وہ گھر سے گیا تو شام کو لوٹا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے کہا "بابرہ! مجھے یقین ہے کہ اب میں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکوں گا اس لیے آج میں نے ایک وکیل سے مل کر وہ ساری کارروائی مکمل کرلی ہے جس کے بعد میری ہر چیز کی مالک تم ہی ہوگی۔ یہ مکان بھی میں نے تمہارے نام کردیا ہے۔ میرے اکاؤنٹ میں جو کچھ ہے' وہ بھی اب تمہارا ہے۔ یہ فائل موجود ہے اس میں سارے کاغذات موجود ہیں۔ ان میں بعض جگہ تمہیں بھی دستخط کرنا ہیں۔"

"مجھے کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے داور!" بابرہ طلعت نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا لیکن پھر اس نے داور کے شدید اصرار سے تنگ آکر ان کاغذات پر دستخط کردیے تھے۔

پھر دس دن بعد داور نے کہا تھا "میں تمہیں ایک چیز اور بھی دینا چاہتا ہوں۔ میری جیب میں اب ہر وقت ایک لفافہ رہتا ہے۔ جب بھی میں مرجاؤں' تم وہ لفافہ میری جیب سے نکال لینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے لیے میرا ایک قیمتی تحفہ ہوگا۔"

"مجھے کسی بھی تحفے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم نے اپنا بینک اکاؤنٹ اور یہ مکان جو میرے نام کیا ہے' اس سے بھی مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے۔ تمہارے بعد اگر مجھے کچھ نہ ملے تو بھی میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اپنی باقی زندگی کسی جھونپڑی میں بھی گزار سکتی ہوں۔"

لیکن یہ باتیں کہتے ہوئے بابرہ طلعت کو ذرا بھی خیال نہیں آیا تھا کہ داور اسے واقعی ایک بہت قیمتی تحفہ دینا چاہتا تھا۔
دس ماہ قبل داور پر دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا اور جیسا کہ خود اسے توقع تھی، وہ اس اٹیک سے جانبر نہ ہو سکا۔
بابرہ طلعت کو اس کی موت کا بھی افسوس نہیں ہوا تھا لیکن اس نے داور کی جیب سے وہ لفافہ نکال کر اپنے پرس میں ڈال لیا تھا۔
داور کی تدفین کے دو دن بعد اسے اس لفافے کا خیال آیا تو وہ اس نے اپنے پرس میں سے نکالا اور اسے چاک کیا۔ لفافے میں اس کے نام ایک خط تھا۔
"بابرہ! ہارٹ اٹیک کے بعد نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں اب زندہ نہیں بچوں گا۔ پچیس چھبیس سال پہلے جب میں بے کاری سے تنگ آکر جمشید کا آلۂ کار بنا تھا، اس وقت یقیناً میرا ضمیر مردہ ہو چکا تھا۔ وہ مردنی طویل عرصے تک قائم رہی لیکن کچھ دن ہوئے میں نے ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس کتاب کے مضمون نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔ جب میرا ضمیر بیدار ہوا تو اس پر میں ایک بہت بڑا بوجھ بھی محسوس کرنے لگا۔ مجھے یقین ہے کہ ضمیر کے اس بوجھ ہی کی وجہ سے مجھ پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں اس سے زندہ تو بچ گیا لیکن وہ بوجھ میرے ضمیر پر بدستور رہا۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ مجھ پر پھر ہارٹ اٹیک ہوگا۔ اگر میں اس سے بھی زندہ بچ گیا تو تیسرا ہارٹ اٹیک بھی ہوگا اور میں زندہ نہیں بچ سکوں گا۔ میں نے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کی ایک کوشش یہ کی کہ جو کچھ بھی میرے پاس تھا، وہ سب کچھ تمہارے نام کر دیا لیکن اس سے بھی میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا نہیں ہو سکا اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک میں تمہیں تمہاری سب سے قیمتی چیز نہیں لوٹا دوں گا میرے ضمیر کا بوجھ ختم نہیں ہو سکے گا لیکن مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ زندہ رہتے ہوئے تمہاری وہ چیز تمہیں لوٹا دوں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے تمہاری آنکھوں سے ابلتی ہوئی نفرت کی آگ سے جھلسنا پڑے گا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ آگ میری موت کا سبب بن جائے گی تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو سسک سسک کر ایک بہت ہی اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری چیز تمہیں اسی وقت ملے جب میں مر جاؤں اور اس کا مجھے یقین ہے کہ میری موت اب مجھ سے زیادہ دور نہیں ہے۔
بابرہ! اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ شاید اس طرح میری روح کو سکون مل سکے۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ میں نے پیسے کی ہوس میں ایک طرف تو تمہیں گندگی میں دھکیل دیا اور دوسری طرف تمہیں جمشید تک بھی نہیں پہنچنے دیا جبکہ میں اس سے برابر ملتا رہا ہوں اور شروع سے آج تک میں نے اسے بلیک میل کیا ہے۔ میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ میرے مطالبات پورے نہیں کرے گا تو میں تمہیں اس کے بچے سے آگاہ کر دوں گا، لیکن تمہارے ساتھ اس سے بھی بڑی برائی میں نے یہ کی کہ تم سے تمہاری بیٹی کو چھین لیا۔ تم نے کسی مردہ بچے کو جنم نہیں دیا تھا بابرہ! تم ایک بیٹی کی ماں بنی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ کسی دن میں اس بچی کے عوض بھی جمشید خاں سے بہت کچھ حاصل کر سکوں گا۔ مجھے اس کے عوض دو لاکھ روپے ملے بھی تھے جو آج کے دور میں تو کوئی بڑی رقم نہیں لیکن بیس اکیس سال پہلے وہ بہت بڑی رقم تھی۔
تمہاری بچی کو میں نے لے جا کر ایک مسجد کی سیڑھیوں پر ڈال دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ....."
داور نے اس خط میں سمیرا کے بارے میں ساری تفصیل لکھ ڈالی تھی اور جمشید خاں کا پتا بھی لکھ دیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد بابرہ طلعت بے قرار ہو گئی تھی۔ اس نے فوری طور پر مکان بیچ کر ساری رقم جمشید کے شہر کے ایک بینک میں ٹرانسفر کروا دی تھی اور پھر خود بھی اس شہر میں پہنچ گئی تھی لیکن ان سب کاموں میں جو چند دن لگے تھے۔ ان دنوں میں وہ یہ سوچ کر رو پڑی تھی کہ اگر وہ اپنی بچی سے ملی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی، ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک طوائف کی بیٹی تھی۔
جمشید کے شہر پہنچ جانے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ جمشید خاں سے انتقام نہیں لے گی کیونکہ اس کی بیٹی اسی کے سائے میں پرورش پا رہی تھی۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ سمیرا سے کبھی نہیں ملے گی اور کبھی کبھی اسے دور ہی سے دیکھ کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا کرے گی۔
یہی اس نے کیا بھی تھا۔ یہاں آکر اس نے اوسط درجے کا ایک ایسا اپارٹمنٹ خرید لیا تھا جہاں ٹیلی فون بھی تھا اور پھر ایک کار خریدنے کے بعد وہ جمشید خاں کے بنگلے پر اس وقت پہنچی تھی جب سمیرا کو کالج جانے کے لیے گھر سے نکلنا ہوتا۔
بنگلے سے کچھ فاصلے پر کار کھڑی کر کے وہ انتظار کرتی رہی تھی لیکن صرف دس منٹ کے بعد ہی اس نے سمیرا کو ایک کار میں بنگلے سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ داور نے اسے اپنے خط میں یہ بات بتا دی تھی کہ سمیرا اس سے بہت مشابہ ہے لیکن اگر وہ یہ بات نہ بتاتا تو بھی اس شباہت ہی کی وجہ سے بابرہ طلعت اسے پہچان ہی لیتی۔
جس بچی کو اس نے جنم دیا تھا، اسے جوان دیکھ کر بابرہ طلعت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پھر وہ اپنا دل بھی مسوس کر رہ گئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا ایک اور بہت بڑا المیہ تھا۔ وہ کیونکہ طوائف بن چکی تھی اس لیے اپنی بیٹی پر اپنا منحوس سایہ ہرگز نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس نے صرف اسی تسکین کو اپنا مقدر سمجھ لیا کہ اس کی بیٹی اپنے باپ کے پاس پہنچ چکی تھی۔
جمشید کے بنگلے کے پاس کار کھڑی کر کے سمیرا کو دیکھنے میں اسے یہ خدشہ تھا کہ کبھی جمشید اسے نہ دیکھ لے اس لیے اس نے

سمیرا کے کالج جانا شروع کردیا۔ جب سمیرا کالج پہنچتی تو وہ اپنی کار میں وہاں موجود ہوتی اور جب کالج کی چھٹی کا وقت ہوتا تو وہ پھر وہاں پہنچ جاتی۔ اس طرح اسے دن میں دو مرتبہ سمیرا کو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ جب سے اس شہر میں آئی تھی' یہی اس کا معمول تھا۔

یہ ساری کہانی بابرہ طلعت نے سمیرا کو بھی سنا دی لیکن یہ پہلو چھپا گئی کہ داور نے اسے ایک طوائف بنا دیا تھا۔

دنیا کی کوئی شریف عورت اپنی بیٹی کو یہ کیسے بتا سکتی تھی کہ وہ ایک طوائف بن چکی ہے۔

سمیرا وہ سب کچھ سنتے ہوئے مسلسل روتی رہی۔

○☆○

یہی کہانی سمیرا نے صد یار خاں کو بھی سنا دی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اپنی ماں کی زندگی کے یہ واقعات سن کر مجھے بہت اذیت پہنچی تھی۔ اس میں اگر میرے لیے کوئی خوشگوار پہلو تھا تو صرف یہ کہ میں جمشید خاں کی لے پالک نہیں بلکہ ان کی حقیقی بیٹی ہوں۔"

"اس کے باوجود آپ نے اپنے والد کو اغوا کیا یا کروایا؟"

"ہاں۔" سمیرا نے کہا "دراصل میں چاہتی ہوں کہ ڈیڈی میری ماں کو قبول کرلیں۔ دراصل میری ماں کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ خود کو ڈیڈی کی بیوی ثابت کرسکیں لیکن میں نے ان کے سامنے عہد کیا تھا کہ میں انہیں ان کا حق دلوا کر رہوں گی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ میری ماں اب ایسا نہیں چاہتیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں بس چھپ چھپ کر ان سے ملتی رہوں۔ ان کا خیال ہے کہ اب اگر ڈیڈی نے انہیں قبول کرلیا تو میری زندگی میں کوئی خلفشار آسکتا ہے لیکن اپنی اس بات کی وضاحت انہوں نے نہیں کی۔"

سمیرا نے بعد کے واقعات بھی بیان کردیے۔ اس نے ایاز کو بھی ان سب باتوں سے اور اپنی خواہش سے آگاہ کردیا تھا۔

"تمہیں اس معاملے میں میری مدد کرنا ہوگی ایاز۔" سمیرا نے اس سے کہا تھا۔

"مگر کس طرح سمیرا!"

"کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ ڈیڈی اس حقیقت کا اعتراف کرلیں اور میری ماں کو قبول کرلیں۔"

ایاز سوچ میں پڑ گیا اور کافی دن تک سوچ میں پڑا رہا۔ سمیرا اس سے روزانہ پوچھتی رہی کہ اس نے کوئی تدبیر سوچی یا نہیں۔ اس دوران میں وہ بابرہ طلعت سے بھی برابر ملتی رہی۔ بابرہ طلعت کا خیال تھا کہ جمشید اس بات کا اعتراف ہرگز نہیں کرے گا۔

پھر ایک دن ایاز نے سمیرا سے کہا "اگر تم گوارا کرسکو تو ایک تدبیر پر عمل کیا جاسکتا ہے۔"

"کس تدبیر پر؟"

"کسی طرح تمہارے ڈیڈی کو اغوا کرکے ان سے اعتراف کرایا جائے۔"

"یعنی ان پر تشدد کرکے!" سمیرا چونک پڑی تھی "نہیں ایاز!" اس نے مضطرب لہجے میں کہا "گو کہ انہوں نے میری ماں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے لیکن میں ان سے اتنی محبت کرنے لگی ہوں کہ ان پر تشدد تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔"

"اچھا!" ایاز نے ایک طویل سانس بھی لی تھی "تو پھر انہیں اغوا کرنے کے بعد انہیں ذرا دھمکا کر ان سے اعتراف کرانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔"

"انہیں اغوا کرکے کہاں لے جایا جاسکتا ہے؟"

"میرے گھر میں۔" ایاز نے کہا "ڈیڈی اور ممی میری چھوٹی بہن سے ملنے یورپ گئے ہوئے ہیں۔ گھر خالی ہے۔ اس دن میں ملازمین کو بھی چھٹی دے دوں گا جس روز تمہارے ڈیڈی کو اغوا کیا جائے گا۔"

ایاز کے اس منصوبے نے سمیرا کو خاصا پریشان کردیا تھا لیکن اس پر یہ جنون طاری تھا کہ وہ اپنی ماں کو ان کا حق دلوا کر رہے گی۔

آخر گزشتہ روز اس نے ایاز کو فون پر اطلاع دی کہ رات کی تاریکی میں جمشید خاں کو اغوا کیا جاسکتا ہے۔

"ڈیڈی کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" سمیرا نے کہا تھا "آج سائرہ لندن گئی ہے۔ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کے باوجود ڈیڈی اسے ائرپورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ آج انہیں شادی کی ایک ایسی تقریب میں شرکت کرنا ہے جسے وہ کسی وجہ سے نظرانداز نہیں کرسکتے۔ ممی کی طبیعت بھی کچھ خراب ہوگئی ہے ورنہ وہ ان کے ساتھ جاتیں تو کار ڈرائیو کرتیں۔ مجبوراً ڈیڈی مجھے اپنے ساتھ لے جارہے ہیں۔ وہاں سے واپسی میں رات تو خاصی ہوجائے گی۔ میں واپسی کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرسکتی ہوں جہاں زیادہ تاریکی ہو۔ اس راستے کے کسی تاریک مقام پر ڈیڈی کو اغوا کیا جاسکتا ہے۔ اب یہ تم سوچو کہ ایسا کس طرح کیا جاسکتا ہے۔"

"تم ان کے ساتھ جاؤ گی کس وقت؟ اور کہاں؟"

"ڈیڑھ گھنٹے بعد۔" سمیرا نے جواب دیا اور سبزہ زار کا نمبر بھی بتایا۔

"گویا سوچنے کے لیے میرے پاس بہت کم وقت ہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا تم آدھے گھنٹے بعد مجھے پھر فون کرو۔"

آدھے گھنٹے بعد سمیرا نے اسے فون کیا تو ایاز نے اسے منصوبہ بندی سے آگاہ کردیا۔ اس نے ملازمین کو رات کی چھٹی دے دی تھی۔ اسی نے سمیرا کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ واپسی پر کون سا راستہ

اختیار کرے گی اور کس مقام پر وہ کار کے پچھلے حصے سے نکل کر اس کی اور جمشید خاں کی کنپٹیوں پر ریوالور رکھ کر اس سے کار روکنے کے لیے کہے گا۔

"ریوالور؟" سمیرا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ نقلی ریوالور ہوں گے اور پھر میں کلوروفارم سنگھا کر تمہارے ڈیڈی کو بے ہوش کردوں گا۔"

"تم کار کے پچھلے حصے میں پہنچو گے کیسے؟"

"تم جب کار وہاں پارک کرنا تو اسے لاک مت کرنا۔ میں کار میں چھپنے کے بعد اسے اندر سے لاک کرلوں گا۔"

چنانچہ پھر اسی منصوبے پر عمل درآمد کیا گیا تھا۔ جمشید خاں کو ایاز اپنے گھر پہنچانے کے بعد اپنی کار میں سمیرا کی کار کے ساتھ اس جگہ گیا تھا جہاں سمیرا کو کار کھڑی کرنا تھی۔ ایاز کو معلوم تھا کہ گھنٹے آدھے گھنٹے بعد اس راستے سے کوئی پولیس موبائل ضرور گزرتی ہے۔

ایاز کے منصوبے کے مطابق وہاں پولیس موبائل کا انتظار کیا گیا تھا اور جب اسے پولیس موبائل آتی نظر آگئی تھی تو ایاز نے کلوروفارم سے سمیرا کو بے ہوش کیا تھا اور کچے راستے پر اتر کر تیزی سے چلتا ہوا دوسری سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی کار وہیں کھڑی کی تھی وہاں سے وہ تیز رفتاری کے ساتھ واپس اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔

اس منصوبہ بندی سے، سمیرا نے ٹیلی فون پر بابرہ طلعت کو بھی آگاہ کردیا تھا۔

○☆○

سب کچھ بتانے کے بعد سمیرا نے بھرائی ہوئی آواز میں صمد یار خاں سے کہا "میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب آپ میرے اور ایاز کے خلاف جو ایکشن بھی لینا چاہیں، وہ لے لیں۔ مجھے اس سزا کی کوئی پروا نہیں جو مجھے ملے گی۔ صرف اس بات کا دکھ ہو گا کہ میری وجہ سے ایاز بھی اس معاملے کی لپیٹ میں آئے گا اور اپنے ڈیڈی کے سامنے میری بھی نظریں جھک جائیں گی۔" سمیرا کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میرے ضمیر پر کبھی کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، ایک بدنصیب عورت کو اس کا حق دلوانے کے لیے کیا ہے۔"

صمد یار خاں غور سے سمیرا کی طرف دیکھتا ہوا کچھ سوچتا رہا۔

"بتائیے!" سمیرا کچھ توقف سے بولی "اب آپ کیا ایکشن لینا چاہتے ہیں۔"

"مس جمشید!" صمد یار خاں نے ایک طویل سانس لی "میری زندگی کا یہ پہلا اور غالباً آخری کیس ہے کہ میں ایک غیر قانونی اقدام کو نظرانداز کردینا چاہتا ہوں۔ آپ نے ابھی اپنی ماں کے لیے ایک بدنصیب عورت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ اسی لیے میں نے یہ فوری فیصلہ کیا ہے کہ اگر میں اس بدنصیب عورت کو اس کا حق دلوانے کے سلسلے میں آپ سے تعاون کروں تو ریٹائرمنٹ سے پہلے یہ میری زندگی کا ایک نیک کام ہوگا۔"

سمیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن صمد یار خاں کی باتوں سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

صمد یار خاں پھر بولا "میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ قانون اس لیے بنایا گیا ہے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہونے دے اور کیونکہ اس معاملے میں زیادتی، بلکہ بہت زیادہ انسانیت سوز سلوک آپ کی ماں کے ساتھ ہوا ہے لہٰذا مجھے اسی کے ازالے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

سمیرا نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ پھر وہ کچھ بولنے ہی والی تھی کہ لاؤنج کی طرف سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔

"کیا میں فون سن آؤں؟" سمیرا جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

صمد یار خاں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔

سمیرا نے جلدی سے لاؤنج میں پہنچ کر ریسیور اٹھایا "ہیلو!"

"مبارک ہو سمیرا!" ایاز کی آواز سنائی دی "کام ہو گیا۔"

"کیسے؟" سمیرا خوش ہو کر بولی۔

"تم نے کہا تو تھا کہ میں تمہارے ڈیڈی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کروں لیکن مجھے معاف کردینا کہ مجھے تھوڑی سی زیادتی کرنا ہی پڑی۔"

"کیا مطلب!" سمیرا کچھ چیخ سی پڑی۔

"غلط نہ سمجھو! میں نے ان پر اذیت رسانی کے آلات کا استعمال نہیں کیا تھا۔ مجھے بس اتنا کرنا پڑا کہ میں نے انہیں کرسی سے باندھے رکھا۔ کل رات سے اب تک بندھے بندھے ان کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ آخر ان کے اعصاب جواب دے گئے۔ شاید انہوں نے یہ بھی سوچا ہو کہ اگر وہ ان باتوں کا اعتراف کر بھی لیں گے تو اس سے ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور بعد میں وہ اپنے اس اعتراف سے منحرف ہو جائیں گے۔ دراصل انہیں اس کا علم ہی نہیں تھا کہ کرسی کے پیچھے رکھے ہوئے ایک بہت حساس ٹیپ ریکارڈر پر ان کا اعتراف ٹیپ بھی ہو جائے گا۔"

"اوہ!" سمیرا کے منہ سے نکلا "اور اب ان کی کیا حالت ہے؟"

"میں نے جب انہیں ان کا ریکارڈ شدہ بیان سنایا تھا تو ان کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔ بہرحال اب میں نے انہیں کرسی سے کھول کر لٹا دیا ہے۔ ان کا دورانِ خون ٹھیک ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ اب تم اپنی والدہ کو یہاں بھیج دو۔ اس طرح وہ سمجھ لیں گے کہ یہ

سب کچھ تمہاری والدہ نے کیا ہے۔ تمہارے بارے میں انہیں کبھی نہیں معلوم ہوسکے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم انتظار کرو۔" سمیرا نے جلدی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کیا اور پھر تیزی سے ڈرائنگ روم میں لوٹی۔ وہاں اس نے صمد یار خاں کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

صمد یار خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ ابھی آپ کو میرے مزید تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"آپ کے ڈیڈی اب بھی اس بیان سے منحرف ہوسکتے ہیں۔ وہ عدالت میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بیان لینے کے لیے ان پر تشدد کیا گیا لیکن اگر میں بھی آپ کی والدہ کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور انہیں اپنا شناختی کارڈ بھی دکھا دوں تو پھر وہ یقیناً جھاگ کی طرح بیٹھ جائیں گے۔"

○☆○

کال بیل کی آواز سن کر بابرہ طلعت نے دروازہ کھولا۔

"تم!" بابرہ طلعت نے سمیرا کو دیکھتے ہی کہا "میں تو آج سارا دن تمہارے فون کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ میرے یقین کے مطابق تو تمہیں مجھ سے یہی کہنا چاہیے کہ تمہارے ڈیڈی نے اعتراف نہیں کیا لیکن تمہارا چہرہ تو خوشی سے کھلا ہوا ہے۔"

سمیرا تیزی سے بولی "آپ فلیٹ لاک کیجیے اور میرے ساتھ چلیے۔"

"کہاں؟" بابرہ طلعت نے چونک کر پوچھا۔

"آپ چلیے تو سہی۔"

بابرہ طلعت نے بہت الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ سمیرا کی خواہش پر عمل کیا۔ وہ سمیرا کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھی۔ سمیرا کار کو حرکت میں لے آئی اور پھر اس نے مختصر الفاظ میں لیکن تیزی سے بابرہ طلعت کو سب کچھ بتانا شروع کردیا۔

سب کچھ جاننے کے بعد بابرہ طلعت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ اچھا نہیں ہوا بیٹی۔ کاش تمہارے ڈیڈی نے یہ اعتراف نہ کیا ہوتا۔"

"آج تک میں آپ کی ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔"

"میں بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ اب میری اور جمشید کی رفاقت کسی وقت بھی تمہاری زندگی کو خلفشار میں ڈال سکتی ہے۔"

"کس قسم کا خلفشار؟"

"کاش میں تمہیں بتاسکتی۔" بابرہ طلعت نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر پوچھا "وہ انٹیلی جنس آفیسر کہاں ہے؟"

"وہ اپنی کار میں ہمارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انٹیلی جنس کے محکمے میں اتنے ہمدرد انسان بھی ہوسکتے ہیں۔ اچھا ہاں! میں آپ سے ایک بات کہنا بھول گئی۔ ڈیڈی کو ساری زندگی اس کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ سارا کیا دھرا میرا تھا۔ میں اس وقت بھی بنگلے کے باہر ہی رک جاؤں گی۔ صرف آپ صمد یار خاں صاحب کے ساتھ اندر جائیں گی۔ میں نے ایاز کو بھی ٹیلی فون پر سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ آپ دونوں کا انتظار کررہا ہوگا۔"

بابرہ طلعت کو دیکھ کر جمشید خاں کا چہرہ فق پڑگیا اور پھر اس کی نظر صمد یار خاں کی طرف بھی اٹھی۔

صمد یار خاں نے فوراً اپنے محکمے کا شناختی کارڈ نکال کر جمشید خاں کو دکھا دیا جس کے بعد جمشید یار خاں کا چہرہ بالکل بجھ کر رہ گیا۔

بابرہ طلعت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "جمشید! اگر مجھے صمد یار خاں صاحب کا تعاون حاصل نہ ہوجاتا تو میں شاید یہ سب کچھ نہ کرپاتی اور یہ سب کچھ کیا بھی میں نے صرف اس وجہ سے کہ میری بیٹی تمہارے ساتھ ہے۔"

جمشید خاں چونکا۔

"ہاں جمشید!" بابرہ طلعت نے کہا "ایک سال پہلے داور کا انتقال ہوچکا ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"کیا اب میرے خلاف کوئی قانونی کارروائی ہوگی؟" جمشید خاں نے صمد یار خاں کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اگر پچیس سال تک سسک سسک کر جینے والی عورت کو اب ایک نئی زندگی مل جائے تو مجھے کسی قانونی کارروائی کے بارے میں سوچنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

جمشید خاں کی نظریں جھک گئیں۔

"جمشید!" بابرہ طلعت کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکتے رہے "کیونکہ میری بیٹی اپنے باپ کے پاس ہے اس لیے میں ماضی کی ساری تلخیوں کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ ہماری ناچاقی کے اثرات ہماری معصوم بچی پر نہیں پڑنا چاہئیں۔"

اور اس طرح وہ سب کچھ ہوگیا جس کی خواہش سمیرا کو تھی۔

دوسرے دن سائرہ لندن سے آئی تو اپنی ماں کی طرح اسے بھی ان حقائق کا علم ہوگیا جو جمشید خاں نے اپنی بیوی قدسیہ کو بتا دیے تھے۔

سائرہ ذرا دیر تو سکتے کی سی حالت میں رہی، پھر سسکتی ہوئی سمیرا سے لپٹ گئی "میری ماضی کی غلطیوں کو معاف کردینا باجی!"

"چھوٹی بہنوں کی غلطیاں تو نظر انداز ہی کی جاتی ہیں سائرہ!" سمیرا نے اسے بڑے پیار سے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اور جب یہ سب کچھ ہوا تو صمد یار خاں صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا، اس نے کوئی نیکی کی تھی یا نافرض شناسی؟

اس کا دماغ کوئی جواب دینے میں متذبذب رہا لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔